محرم الحرام۔ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ
اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

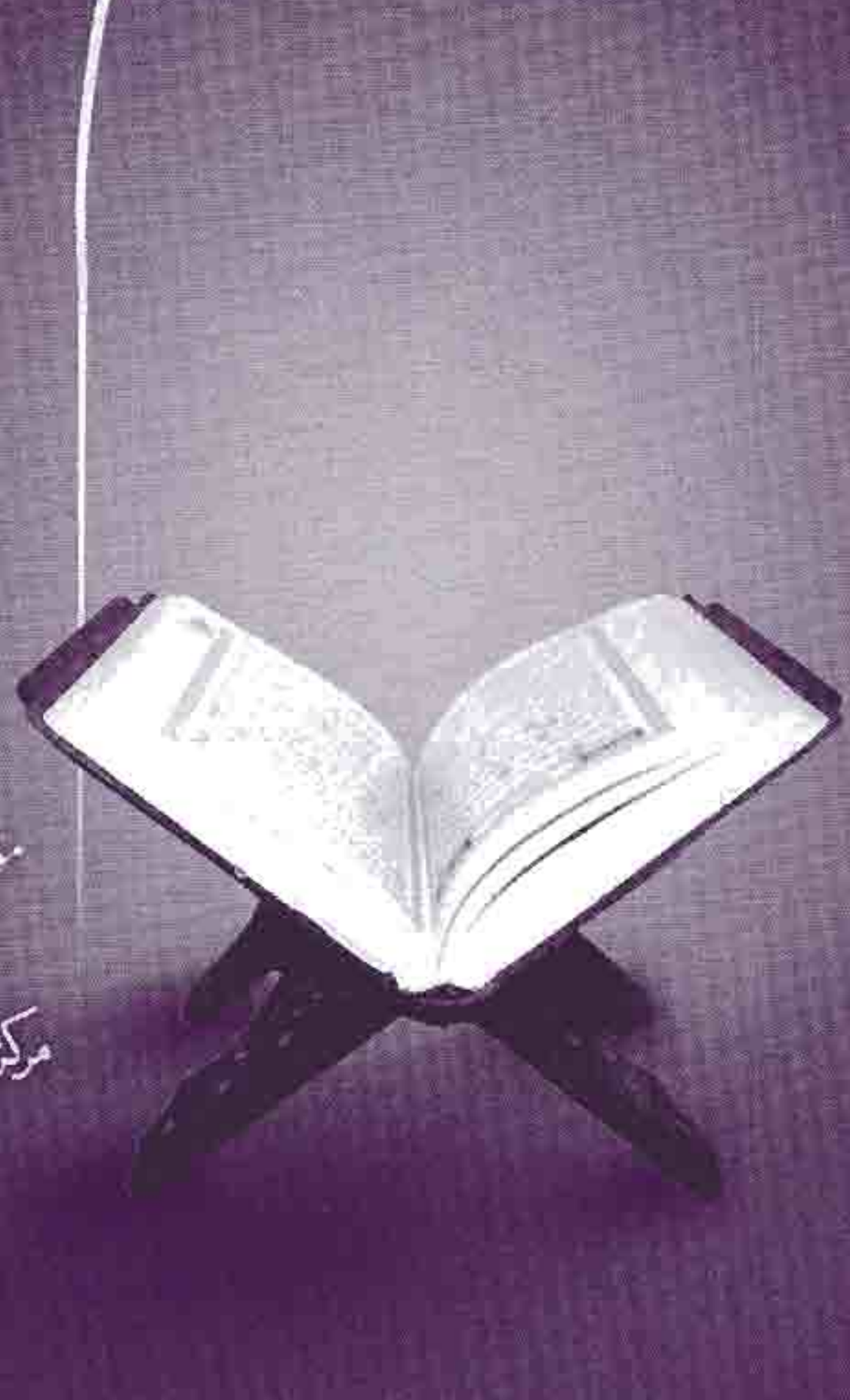

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

صفحات394، قیمت485روپے

حصہ پنجم سُورۃ مَریَم تا سُورۃ السَّجدۃ

صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات

صفحات484، قیمت590روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس

صفحات560، قیمت650روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۵ — شمارہ ۴

محرّم الحرام۔ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ — اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر : حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 240 روپے، فی شمارہ :60 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

پاکستان کی قدر کیجیے!	حافظ عاطف وحید	3

حکمتِ نبویؐ

اصلاحِ نیّت کی ضرورت اور اہمیّت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	6

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل (۷)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	9

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	25

مُکالمہ

حُجیتِ حدیث اور انکارِ حدیث: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر	45

فکر و فلسفہ

''مذہبی تجربے کی علمی ونفسیاتی ساخت'' کا جائزہ	مدثر رشید	69

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	73

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کی قدر کیجیے!

ہندوستان میں انتہا پسند ہندو جماعت کی حکومت کا بننا اور امریکہ جیسی ''سپریم پاور'' میں شیطانی نظریات و ایجنڈے کے اعلانیہ علمبرداروں کا برسرِ اقتدار آنا مسلمانانِ عالم کے لیے باعث تشویش ہے۔ ہندوستان وامریکہ کے مسلمان اپنے مذہبی تشخص کے حوالے سے واضح طور پر ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک امریکی کمیونٹی میں مسلمان گھرانوں میں پھرائے گئے سرکلر سے اس ذہنی کیفیت سے آگاہی ہوتی ہے جس سے وہاں کے مسلمان دوچار ہیں۔ اس سرکلر کے زہریلے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

Dear Terrorist Bitch, We are writing to you as the newly organized Neighbourhood Town Watch. We understand that you currently wear a scarf on your head, and we would like to put you on notice that this will no longer be tolerated in our neighborhood.

Now that the America is great again, we would like to offer you two opportinities to avoid any consequences of your poor previous decisions. First, you can take radical attire off and live like all Americans. Or, your second option, you can go back to the God Forsaken land you came from. America is Great Again. (Neighborhood Town Watch).

یہ اور اس قسم کے بعض دوسرے مہیب اندیشوں کے حوالے سے ایک نکتہ نظر تو یہ ہے کہ یہی عوامل اقوامِ عالم میں امریکہ کی اخلاقی برتری کو ختم کر کے اس کے زوال کا باعث بنیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس انجام سے پہلے عالمِ اسلام پر کیا کیا افتاد پڑے' کیسے کیسے ظلم و بربریت کے مراحل درپیش ہوں اور شیطانی کھیل کیا کیا رُخ دکھائے۔ تاہم ایمان کی بات یہی ہے کہ: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾﴾ (آل عمران)

البتہ ایک دوسرا پہلو جس کا ہمیں بہت شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دگرگوں حالات —— خاص طور پر دینی و مذہبی اعتبارات سے —— بعض لوگوں کے اندر ایسے مایوسی اور ناامیدی کے احساسات پیدا کر دیتے ہیں کہ نادانستگی میں انہیں پاکستان کے وجود و بقاء ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ بقول شاعر: ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

اور ؎

اسلام کو گر تیری فضا راس نہ آئے
اے میرے وطن تجھ کو کوئی آگ لگائے!

اور یہ خیال شیطانی وسوسہ بن کر مسلط ہوجاتا ہے کہ پاکستان کو وجود میں آئے زمانہ ہوگیا۔ نہ اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی کہیں دکھائی پڑتا ہے اور نہ ہی حریت واخوت ومساوات کے اعلیٰ نمونوں کا کوئی سراغ ڈھونڈے سے ملتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اسلامی مملکت ہے بھی یا نہیں۔ یہی سوچ اور وساوس اس بات میں بھی شبہات پیدا کردیتے ہیں کہ جولوگ اس سرزمین کی سرحدوں کی حفاظت میں جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں انہیں مرتبہ شہادت بھی ملے گا یا نہیں.....وغیرہ وغیرہ۔

مذہبی اعتبار سے یہ احساس انتہا پسندانہ نظریات کے فروغ کا باعث ہوتا ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ انہی احساسات کو مہمیز دے کر مسلمانوں کی داخلی شیرازہ بندی کو منتشر کرنا اعداء الدین واعداء المسلمین کی خواہشات میں سرفہرست ہے۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت اہلِ علم کے ذمہ ہے کہ جس ملک میں مسلمان حکمران ہو اور عوام کی اکثریت بھی مسلمانوں پر مشتمل ہو —— لیکن وہاں اسلامی شریعت کا قانونی اور عدالتی سطح پر نفاذ نہ ہو تو کیا ایسے ملک کو اسلامی مملکت قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح یہ بھی واضح کرنا علمائے امت پر لازم ہے کہ ایسے ملک پر اگر کفار ومشرکین حملہ آور ہوجائیں تو کیا مسلمان عوام پر سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت لازم ہے یا نہیں؟ اور جولوگ اس راہ میں جان کی بازی لگادیں وہ شہید ہیں یا نہیں؟

اس میں شک نہیں کہ خارجی حالات کے اعتبار سے صورتحال اور نوعیتِ معاملہ میں عارضی اور جزئی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے جس سے نفسِ مسئلہ پر اہلِ علم کی رائے بھی بدل سکتی ہے' جیسے کہ ۹/۱۱ سے پہلے اور بعد کے حالات میں بعض اعتبارات سے فرق ہے' تاہم متذکرہ بالا سوالات اپنی جگہ دائمی حیثیت کے حامل ہیں اور ان کے بارے میں واضح موقف قائم کرنا دینی وملی اعتبار سے انتہائی ضروری ہے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ اس اہم اور نازک معاملے میں صرف ایسے اہلِ علم کی آراء کو ہی قابلِ التفات گردانا جاسکتا ہے جن کی علمی استعداد وصلاحیت اور دیانت مسلّم ہے۔ اور ایسے ''موسمی علماء'' سے اجتناب لازم ہے جو حالات کے وقتی دباؤ سے متاثر ہوکر انتہائی نتائج تک پہنچنے میں غیر ضروری مستعدی دکھائیں اور دینی وفکری پراگندگی کا باعث بنیں۔ ایسے نام نہاد اہلِ علم کی سب سے واضح شناخت یہ ہے کہ وہ اپنے فکری مخالفین کو بکاؤ مال اور سرکاری درباری علماء قرار دے کر اپنے موقف میں وزن پیدا کرنے میں عافیت اور کامیابی ڈھونڈتے ہیں۔

ویسے تو یہ بحث گہرے تفکّر وتفقّہ کی محتاج ہے' البتہ سردست ایک واضح موقف ایسا دستیاب ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری مراد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی رائے سے ہے جو مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ مولانا تھانویؒ کے مطابق اسلامی مملکت کی تعریف یہ ہے کہ جس ملک کا حکمران مسلمان ہو اور وہ اسلامی قانون نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو' چاہے وہ کتنا ہی گنہگار ہو' تو وہ ملک اسلامی

قانون کے مطابق اسلامی مملکت ہے' چاہے وہ مسلمان فرماں روا' مسلم امیر المومنین یا سلطان بڑی حکومتوں سے ڈر کر یا اپنے ملک کی بغاوتوں سے ڈر کر یا اپنی ایمانی کمزوری یا بشری کمزوری کی وجہ سے اسلامی قانون نافذ نہ کرتا ہو' لیکن اس کو اسلام نافذ کرنے کی قدرت ہے تو اس قدرت کی بنا پر وہ مملکت اور سلطنت شریعت کی رو سے اسلامی سلطنت کہلائے گی (۱)۔ اس موقف کی رُو سے ظاہر ہے پاکستان اسلامی مملکت ہے اور اسی لیے اگر اس کی ایک انچ زمین کی حفاظت کے لیے بھی کوئی جان دے گا تو وہ شہید کہلائے گا۔ (۲)

اس واضح موقف سے دلیل کی بنیاد پر علمی اختلاف اہلِ علم کا حق ہے — ایسے اہلِ علم جن کی علمیت و دیانت مسلّم ہے۔ تاہم ہمارے خیال میں جو بھی اختلافی رائے سامنے آئے گی اس کی حیثیت اجتہادی رائے کی ہی ہوگی جس سے فریقین کی آراء کی اہمیت و وُقعت متاثر ہونے والی نہیں۔ آج پاکستان جن داخلی و خارجی محاذوں پر سرگرم عمل ہے' ان حالات میں پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے ساتھ ساتھ جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت بھی ہم پر فرض کے درجے میں ہے۔ دینی اعتبار سے تمام تر ناگفتہ بہ حالات کے باوصف اس سرزمینِ پاک کے نقصان پر خوشی منانے والے نادان اور انتہا پسند ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے۔ ہندوستان' بنگلہ دیش' میانمار اور دیگر بہت سے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کی حالتِ زار سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ خدانخواستہ پاکستان کی سلامتی پر آنچ آئی تو یہاں کے مسلمان بھی گائے ذبح کرنے پر گردن زدنی قرار پائیں گے۔ اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا عملی نمونہ تو دور کی بات ہے' نماز روزے کے بھی لالے پڑ سکتے ہیں۔ اور ایسے میں نظام خلافت کی بات کرنا تو درکنار' خواب دیکھنا بھی قابل دست اندازیٔ پولیس بن سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس مخصوص معاملے میں فکری انتشار کو خالص علمی بنیادوں پر دور کیا جائے اور پاکستان کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت پر تمام مکاتبِ فکر کو یکسوئی کے ساتھ جمع کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے!

❁❁❁

---

(۱) اس بات سے قطع نظر کہ ایسی ناقص اسلامی مملکت میں حقیقی اور کامل نظامِ شریعت کا نفاذ اُسی طرح ضروری ہے جیسے ایک فاسق و فاجر کلمہ گو کے لیے صالح صاحبِ ایمان بننا ضروری ہے۔

(۲) بحوالہ ''اسلامی مملکت کی قدر و قیمت'' از مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ۔ صفحہ نمبر ۳۴

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اصلاحِ نیّت کی ضرورت اور اہمیّت

مدرّس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی، فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ، وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ)) (رواہ البخاری و مسلم)

امیر المؤمنین ابوحفص عمر بن خطاب ؓ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق جزا ملے گی۔ پس جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کے لیے ہو تو اُسی کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے لیے ہے۔ اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

اس حدیث کے راوی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق ؓ ہیں۔ ابوحفص ان کی کنیت ہے۔ زوجۂ رسولؐ حضرت حفصہ ؓ حضرت عمر ؓ کی صاحبزادی ہیں' اسی نسبت سے آپ کو ابوحفص کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں نے خود رسول اللہ ﷺ کی زبان سے سنی ہے —— یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ حدیث کی اکثر کتابوں میں اس کو سب سے پہلے درج کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے چالیس احادیث حفظ کرنے کی فضیلت بتلائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے میری امت کی حفاظت کی خاطر دین کے معاملے میں چالیس احادیث حفظ کیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقہاء اور علماء کے گروہ میں سے اٹھائے گا''۔ چنانچہ پچاس سے زائد علمائے کرام نے چالیس چالیس احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ ان میں امام یحییٰ بن شرف الدین النوویؒ کا مرتب کردہ چالیس احادیث کا مجموعہ مشہور و معروف اور مقبول ترین ہے۔ زیرِدرس حدیث اس مجموعے کی پہلی حدیث ہے۔ امام نووی کا منتخب کردہ ایک اور مجموعۂ احادیث 'ریاض الصالحین' کے نام سے مشہور ہے' جو علماء کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امام نووی نے صرف ۴۵ سال عمر پائی مگر اتنی مختصر عمر میں کتاب وسنت سے متعلق ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں جنہیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ کسی عمل کے انجام دینے میں اصل اہمیت نیت ہی کی ہے۔ نیت کی اچھائی کا تعلق نیک کاموں سے ہے۔ اگر کسی بُرے کام کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ کام

اچھا نہیں گنا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کسی حرام مال کمانے والے کی چوری اس نیت سے کرتا ہے کہ اس طرح حاصل ہونے والا مال وہ ضرورت مندوں اور فقیروں میں تقسیم کر دے گا تو ایسی نیت سے چوری کرنا اچھا عمل نہیں سمجھا جائے گا۔ گویا لازم ہے اچھی نیت سے کیا ہوا کام جائز اور نیک بھی ہو۔ البتہ نیک کام اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں یا متضاد ہوں تو بھی اجر پائیں گے۔ ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آیا۔ اس کے پاس سواری کا جانور تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر مسجد کے باہر اسے کوئی کھونٹا نظر نہ آیا جہاں وہ اپنا جانور باندھ لے۔ اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا زمین میں گاڑا' اس کے ساتھ اپنے جانور کو باندھا' نماز پڑھی اور چلا گیا۔ البتہ وہ کھونٹا وہیں گڑا رہنے دیا تاکہ اگر کوئی دوسرا بھی آئے تو یہاں اپنا جانور باندھ لے۔ کوئی صاحب آئے تو انہوں نے سوچا کہ یہ کھونٹا یہاں کیوں لگا ہے۔ اس سے تو آنے والے ٹھوکر کھائیں گے' چنانچہ اس نے وہ کھونٹا اکھاڑ پھینکا۔ جب پوچھا گیا تو بتایا گیا کہ دونوں کو نیک کام کا اجر ملے گا' کیونکہ ہر ایک نے یہ کام اچھی نیت سے کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کی طرف مجاہدین کو روانہ کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے عصر کی نماز منزل پر پہنچ کر ادا کرنی ہے۔ مجاہدین چل پڑے لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے نماز عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا تو اس صورتحال میں کچھ لوگوں نے غروبِ آفتاب سے پہلے نماز عصر ادا کر لی اور یہ سمجھے کہ آپؐ نے یہ حکم صرف اس لیے دیا تھا تاکہ مجاہدین جلدی وہاں پہنچ جائیں۔ جبکہ دوسرے گروہ نے حضور ﷺ کے فرمان کے ظاہری الفاظ پر عمل ضروری سمجھا اور راستے میں نماز عصر ادا نہ کی اور آپؐ کے فرمان کے مطابق نماز عصر قضا کر کے منزل پر پہنچ کر ادا کی۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ مجاہدین کے دونوں گروہوں کو اجر ملے گا کیونکہ ہر ایک کی نیت اچھی تھی۔ جس گروہ نے نمازِ عصر وقت پر پڑھ لی ان کی نیت رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی نہ تھی بلکہ آپ کے حکم کا مدعا اور مقصد ان کے پیش نظر تھا۔ دونوں گروہوں کی نیت صحیح تھی اور اعمال کا دارومدار تو نیتوں پر ہے۔

نیت کا تعلق زبان سے نہیں' دل سے ہے۔ اگر کوئی آدمی صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہے تو وہ روزہ دار نہیں ہے' اس لیے کہ اس نے روزے کی نیت کے بغیر بھوک اور پیاس برداشت کی۔ روزہ رکھنے اور روزہ افطار کرنے کی دعائیں مشہور ہیں۔ یہ دعائیں زبان سے ادا کرنے کی ہیں جبکہ نیت کا تعلق زبان سے نہیں ہے' چنانچہ روزے کی دل میں نیت کرنا ہی کافی ہے۔ چنانچہ سحر و افطار کی مشہور دعائیں سنت سے ثابت نہیں۔

ایک شخص کی نیت ہے کہ صبح سویرے اپنی گاڑی میں سوار ہو کر گوجرانوالہ جائے گا۔ ہر شخص اس بات کو مضحکہ خیز سمجھے گا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر زبان سے یہ نیت کرے کہ میں گوجرانوالہ جانے کا ارادہ کرتا ہوں' کیونکہ نیت کا تعلق دل سے ہے۔

مسلمان پر ہزاروں روپے خرچ کر کے عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:
﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج:۳۷) ''اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت اور نہ خون بلکہ اس تک پہنچتا ہے تمہارا تقویٰ''۔ یعنی قدر و قیمت اور اجر اس بات کا ہے کہ قربانی کرنے والے نے کس نیت سے قربانی کی ہے۔ آیا نام و نمود کے لیے اتنی رقم خرچ کی ہے یا صرف گوشت کھانا مقصود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اچھے سے اچھے اور قیمتی جانور کی قربانی بھی مقبول نہ ہوگی' کیونکہ اعمال کا دار و مدار

نیتوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نیتوں کو جانتا ہے۔ جس کام کے کرنے میں نیت اللہ کی رضا کا حصول ہو وہ کام عنداللہ ماجور ہے۔

ایک صحابیؓ نے مکان بنایا تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ میرے ہاں تشریف لائیں' برکت ہوگی۔ آپؐ گئے اور ان کا گھر دیکھا۔ ایک دیوار میں روشن دان تھا۔ آپؐ نے پوچھا: ''یہ کیوں رکھا ہے؟'' کہنے لگے: حضور ﷺ! یہاں سے روشنی اور ہوا آئے گی۔ آپؐ نے فرمایا: روشنی اور ہوا تو آئے گی' اگر تمہاری نیت یہ ہوتی کہ یہاں سے اذان کی آواز آئے گی تو تمہارا یہ عمل اجر وثواب کا باعث ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو چت گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ اس کو قتل کر دیتے کہ اس نے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپؓ نے اس کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ آپؓ اس کو اللہ کی رضا کے حصول کی نیت سے قتل کر رہے تھے' مگر اس نے آپ کے چہرے پر تھوکا تو آپ کو غصہ آ گیا۔ اب اگر اسے قتل کرتے تو یہ قتل فی سبیل اللہ نہیں' بلکہ انتقاماً ہو جاتا اور اجر سے خالی ہوتا' لہٰذا آپؓ نے اسے چھوڑ دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک سفر سے واپس آ رہے تھے۔ اُحد پہاڑ کے قریب آ کر ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ خیال آیا کہ اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر آٹا ہو تو میں لوگوں میں تقسیم کر کے ان کی ضرورت پوری کر دوں۔ پھر خود ہی مسکرائے کہ یہ کیسا خیال ہے! واپس جا کر رسول اللہ ﷺ سے ملے اور اپنے سفر کا حال بیان کیا اور اپنے اس خیال کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ خیال (نیت) کر کے تم نے ضرورت مندوں میں آٹا تقسیم کرنے کا ثواب حاصل کر لیا— دیکھئے' حضرت علیؓ کے پاس آٹا آیا نہ انہوں نے تقسیم کیا' مگر نیت کی وجہ سے ان کو اتنا بڑا اجر حاصل ہو گیا۔

اگر کسی نے اس نیت سے نماز پڑھی کہ لوگ مجھے نمازی کہیں یا اس سے اس کا مقصد کچھ اور ہو تو نماز جیسا اعلیٰ عمل بھی اسے کوئی فائدہ نہ دے گا کہ اس کی نیت میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا نہ تھا۔

زیر درس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق جزا ملے گی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی ہوگی اور جس شخص کی ہجرت حصولِ دنیا کے لیے ہوگی تو وہ اسے پالے گا اور اسے ہجرت کا ثواب نہ ملے گا۔ مثلاً کوئی شخص روزی کمانے کے لیے کسی دور دراز کے ملک میں ہجرت کرتا ہے تو اگرچہ اس نے ہجرت کی مگر وہ ہجرت کا ثواب نہ پائے گا' کیونکہ اس ہجرت میں اس کی نیت رضائے الٰہی نہ تھی۔ اسی طرح اگر کوئی اپنا وطن چھوڑتا ہے کسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر تو اس کی ہجرت اس عورت کے لیے ہی شمار ہوگی۔

ایک شخص نے ایک عورت کی خاطر ہجرت کی تو لوگ اسے مہاجر اُم قیس کہتے تھے' کیونکہ آدمی کی ہجرت اسی کے لیے شمار کی جائے گی جس مقصد کے لیے اس نے ہجرت کی۔ گویا ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ کوئی شخص اگر نیک کام کرنے کی نیت کرتا ہے تو اس کو نیک نیتی کی بنا پر اس کام کے کرنے کا ثواب مل جاتا ہے اگرچہ وہ کسی وجہ سے وہ کام نہ کر سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ کسی برے کام کے کرنے کی نیت پر اسے برا کام کرنے کا گناہ نہیں ملتا' البتہ وہ گناہ کر لے تب ہی وہ گناہ گار شمار ہوتا ہے۔

❁❁❁

مِلاکُ التأوِیل (۷)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورۃ آل عمران

(۱) **آیت** ۳ اور ۴:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

''جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب کو اُتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والی ہے۔''

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳﴾

''اور تورات اور انجیل کو اتارا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اَلْکِتٰب'' سے پہلے نَزَّلَ (''ز'' پر تشدید کے ساتھ) ارشاد فرمایا اور تورات اور انجیل سے پہلے ''اَنْزَلَ'' کا ذکر کیا تو اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''نَزَّلَ'' میں تشدید کی بنا پر تکرار کا مفہوم غالب ہے' جیسے اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے: ضَرَبَ: تو اس سے ایک دفعہ مارنا مراد ہوگا۔ گو اس میں زیادتی کا احتمال ہے' تاہم چونکہ ''ضَرَبَ'' یہاں بغیر تشدید کے ہے اس لیے اس میں کمی زیادہ مناسب ہے' لیکن اگر ''ضَرَّبَ'' تشدید کے ساتھ کہا جائے تو بار بار مارنا مراد ہوگا۔ (جیسے نبی اکرم ﷺ نے ابوجہم کے بارے میں فرمایا: ((فَهُوَ ضَرَّابٌ لِلنِّساء)) کہ وہ تو اپنی بیویوں کو بہت زیادہ مارنے والا ہے۔) (مترجم)

اس لیے ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب کو حالات کے مطابق قسطوں میں اتارا گیا ہے اور اس کا نزول صرف ایک مرتبہ نہیں ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں تورات اور انجیل کے لیے ''اَنْزَلَ'' کا لفظ لایا گیا کہ وہ ایک وقت ہی میں اتاری گئی تھیں۔ دیکھئے تورات کے بارے میں سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ.....﴾ (آیت ۱۴۵)

''اور ہم نے اُس کے لیے تختیوں پر ہر چیز کے بارے میں لکھ دیا جو کہ ہر چیز کے لیے تفصیل بھی ہے اور باعثِ نصیحت بھی ہے' تو پھر اسے مضبوطی سے پکڑ لو.....''

اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو وہ ابتداءِ وحی سے انتہا تک بالاقساط اتارا گیا۔ ابتداء سورۃ العلق سے ہوئی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾

''اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا۔''

اور پھر آخری عمر میں رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات اتریں:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾

(المائدۃ:۳)

''آج تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔''

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫﴾ (البقرۃ: ۲۸۱)

''اور اُس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

اور چونکہ قرآن بالاقساط اُتر رہا تھا اسی لیے کفار نے مطالبہ کیا:

﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ (الفرقان: ۳۲)

''اس (نبی ﷺ) پر قرآن کو یک بارگی کیوں نہ اُتارا گیا؟''

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (الفرقان: ۳۲)

''تاکہ اس طرح ہم آپؐ کے دل کو ثابت قدم رکھ سکیں۔''

سورۃ النساء میں بھی قرآن اور تورات کے ذکر میں اسی فرق کو روا رکھا گیا ہے' فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اپنے رسول پر اتاری۔''

مراد قرآن ہے' اور پھر کہا:

﴿وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اور اُس کتاب پر بھی جسے پہلے اتارا تھا (یعنی تورات)''

البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ان سب کتابوں کے لیے لفظ ''اَنْزَلَ'' بھی لایا گیا ہے جب کہ ان کتابوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہو' یا ذکر تو اکٹھا ہو لیکن بغیر ''الف لام'' کے ہو (جیسے ''الکتاب'' میں الف لام لا کر ایک مخصوص کتاب یعنی قرآن کی طرف اشارہ ہے۔)

پہلی بات کی مثال' جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (الکھف:۱)

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری''

اور دوسری بات کی مثال' جیسے کہ یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ (البقرۃ:٤)

''اور وہ ایمان لاتے ہیں اُس پر جو تمہارے اوپر اتارا گیا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا۔''

اور ایسے ہی سورۃ المائدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ﴾ (آیت ۵۹)

''اور جو ہم پر اتارا گیا اور جو پہلے اتارا گیا۔''

اور قرآن میں اس طرح کثرت سے آیا ہے' اور ایسی جگہوں پر حرف ''مَا'' لایا گیا' جو ہے تو موصول کے معنوں میں لیکن اس میں وہ قوت نہیں ہے جو ''اَلَّذِیْ'' میں پائی جاتی ہے یا ''الف لام'' میں' اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ یہاں کسی کتاب کا نام کے ساتھ بھی ذکر نہیں ہے اور وہ اس لیے کہ ''مَا'' میں ابہام پایا جاتا ہے اور اس میں عہد (یعنی ''الکتاب'' کے ال کی طرح کسی خاص کتاب کی طرف اشارہ کا ہونا) نہیں پایا جاتا۔ برخلاف ''الّذی'' کے جس میں عہد کا پایا جانا ضروری ہے۔

اب اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ دونوں کتابوں کا نام کے ساتھ یا ''اَلَّذِیْ'' کے ساتھ ذکر آ جائے تو پھر مندرجہ بالا تفریق کے ساتھ ذکر ہو گا' یعنی قرآن کے لیے ''نَزَّلَ'' (تشدید کے ساتھ) اور غیر قرآن کے ساتھ اَنْزَلَ (بغیر تشدید) لایا جائے گا' کیونکہ مشدّد لفظ میں بالاقساط اور تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ تورات کے لیے قرآن میں ایک مرتبہ تنزیل (تشدید کے ساتھ) کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا:

﴿مِنْ قَبْلُ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ﴾ (آل عمران:۹۳)

''اس سے پہلے کہ تورات اتاری گئی۔''

یہاں نَزَّل (تشدید کے ساتھ) لانے میں ایک اور چیز کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی تورات کے احکام کا ثابت ہو جانا اور ان کا پکا ہو جانا۔ اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی کہ ان پر جو کچھ حرام ہوا ہے ان کے اپنے ظلم اور زیادتی کی بنا پر ہوا ہے' فرمایا:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ (النساء:۱٦۰)

''جن لوگوں نے یہودیت کو اپنایا' ان کے ظلم کی بنا پر ہم نے ان پاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دے دیا جو ان کے لیے حلال تھیں۔''

﴿وَعَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ﴾ (الانعام:۱٤٦)

''اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ہم نے ان پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے نبی ﷺ کو اور جماعت مؤمنین کو بھی بتا دی تو بنی اسرائیل نے اس بات کا انکار

کیا کہ یہ معاملہ صرف انہی کے ساتھ کیا گیا ہے' بلکہ اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ چیزیں تو ان سے پہلے نوحؑ' ابراہیمؑ اور تمام دوسرے لوگوں پر بھی حرام تھیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ان کی بات کو جھٹلایا:

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ﴾ (آل عمران:۹۳)

''تمام قسم کا کھانا (یعنی ذبیحہ) بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا سوائے اس کے جسے اسرائیل (یعنی یعقوبؑ) نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے اپنے نفس پر حرام کرلیا تھا۔''

یعنی تورات کے نازل ہونے' اس کے احکامات کے دلوں میں جاگزیں ہونے سے قبل' وہ اپنے نفس پر بعض چیزوں کو حرام کر چکے تھے۔ چونکہ یہاں تورات کے احکامات کا اچھی طرح دلوں میں جڑ پکڑ لینے کی طرف اشارہ مقصود تھا اس لیے بجائے ''اَنْزَلَ'' کے ''نَزَّلَ'' بالتشدید لایا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوائے اس جگہ کے کہیں اور یہ لفظ تورات کے لیے نہیں لایا گیا۔

ابوالفضل بن خطیب نے بھی آل عمران کی ابتدائی آیات ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳﴾ کی تفسیر میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں لکھ چکا ہوں لیکن پھر کہا کہ چونکہ قرآن کے ساتھ بھی ''اَنْزَلَ'' کا لفظ لایا گیا ہے جیسے آیت سورۃ الکہف: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (آیت ۱) اس لیے یہاں اشکال پیدا ہو جاتا ہے' لیکن ہماری دی گئی وضاحت سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔ والحمدللہ!

[**اضافات از مترجم**: عبدالرحمٰن کیلانی 'مفردات القرآن' میں لکھتے ہیں:

بعض علماء کا خیال ہے کہ اَنْزَلَ کا لفظ بلندی سے کوئی چیز یکبارگی اتارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے' جیسے ارشاد باری ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر)

''ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں اتارا۔''

اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم یک بارگی نازل نہیں ہوا۔ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس رات کو آسمانِ دنیا پر تو یک بارگی نازل ہو گیا۔ بعد میں حسبِ ضرورت بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا۔

اب تک جو کچھ تحریر میں لایا گیا ہے اس میں پھر بھی کچھ اشکال باقی ہیں مثلاً:

(۱) اَنْزَلَ اور نَزَّلَ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ اَنْزَلَ ایک دفعہ اتارنے کے لیے اور نَزَّلَ بالاقساط اتارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو پھر تورات کے لیے نَزَّلَ کا لفظ کیوں لایا گیا؟ (ابن الزبیر نے اس کا جواب دیا ہے لیکن یہ جواب شافی وکافی نہیں ہے۔)

(۲) بقول ابوالحیان سورۃ الفرقان کی اس آیت میں نَزَّلَ کا لفظ ایک دفعہ نازل ہونے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ (آیت ۳۲)

''اور کافروں نے کہا: اُس پر قرآن ایک دفعہ اکٹھا کیوں نہ نازل کیا گیا؟''

(۳) یہ کہاں سے فرض کرلیا گیا ہے کہ تورات اور انجیل ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی تھیں' بالاقساط نہیں اُتاری گئی تھیں' کیونکہ قرآن کی مانند ان دونوں کتابوں کی آیات بھی حسب ضرورت اور حالات کے مطابق نازل کی جاتی رہی تھیں۔

علامہ محمد الطاہر بن عاشور کی تفسیر مندرجہ بالا اشکالات کا شافی وکافی جواب رکھتی ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی تفسیر اور مقدمہ اولیٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

نَزَّلَ میں تضعیف (یعنی تشدید) اَنْزَلَ کے زائد حرف ''أ'' کی جگہ پر ہے' البتہ بغیر تشدید والے فعل کے مقابلے میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس میں قوت کا اظہار ہوتا ہے' جیسے:

فَسَرَ اور فَسَّرَ' فَرَقَ اور فَرَّقَ' کَسَرَ اور کَسَّرَ' تشدید والے فعل میں زیادہ قوت کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے کَسَرَ کا مطلب ہے توڑا' لیکن کَسَّرَ کا مطلب ہے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب دیکھئے کچھ افعال جو متعدی نہیں ہیں' وہاں پر بھی تشدید لا کر قوت کا اظہار ہو رہا ہے' جیسے مَاتَ اور مَوَّتَ' صَاحَ اور صَیَّحَ' اب اگر فعل مشدّد تعدیہ کے لیے ہو (یعنی اس کا مفعول بھی آ رہا ہو) تو میرے خیال میں وہ اَنْزَلَ کے ہمزہ کے مقابلے میں ہوتا ہے اور اس میں بذاتِ خود قوت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا اِلا یہ کہ یہ کہا جائے کہ اگرچہ دونوں الفاظ کا معنی تو ایک ہی ہے یعنی اتارنا لیکن نَزَّلَ میں اَنْزَلَ کے مقابلے میں الکتاب کی رفعت شان کی طرف اشارہ ہے۔ بالاقساط اتارنے کا مفہوم نہیں ہے۔ اور اسی لیے بقول ابوحیان سورۃ الفرقان کی آیت میں یک بارگی اتارنے کے لیے بھی نَزَّلَ کا لفظ لایا گیا' کہ اس لفظ کے لانے سے قرآن کی عظمت کی طرف تو اشارہ ملتا ہے لیکن بالاقساط اتارے جانے کا مطلب نہیں لیا گیا یعنی چاہے اَنْزَلَ ہو یا نَزَّلَ' اصل مقصود اتارا جانا ہے جو یکبارگی بھی ہو سکتا ہے اور بالاقساط بھی' اور چونکہ تورات اور انجیل بھی دوسرے صحفِ سماویہ کی طرح بالاقساط نازل ہوئی تھیں' اس لیے اَنْزَلَ اور نَزَّلَ میں فرق روا نہیں رکھنا چاہیے۔

اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ نَزَّلَ میں کثرت اور رفعت شان کا مفہوم غالب ہے۔ زمخشری نے الکشاف کے خطبہ الکتاب میں یوں لکھا:

الحمد للّٰہ الّذی اَنْزَلَ الْقُرآن کلامًا مؤلفًا منظّمًا وَنَزَّلَہٗ علی حسبہ المصالح منھما

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے قرآن کو بحیثیت ایک مربوط اور منظّم کلام کے اتارا اور پھر اسے حسب ضرورت بالاقساط اُتارا''

کشّاف کے شارحین لکھتے ہیں کہ علامہ نے یہاں اَنْزَلَ اور نَزَّلَ دونوں لفظ استعمال کیے ہیں اور نَزَّلَ کا لفظ لا کر اس کثرت کی طرف اشارہ کر دیا جو قرآن کو بالتدریج اور بالاقساط لانے کا تقاضا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اَنْزَلَ کے بجائے نَزَّلَ (یعنی ہمزہ کے بجائے تشدید) لانے میں اصل معنی میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا' یعنی دونوں کا مطلب ہے اُتارنا' لیکن لفظ خفیف (جیسے اَنْزَلَ) سے لفظ ثقیل (جیسے نَزَّلَ) کو اختیار کرنا' اس کی کثرت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

ابن عاشور کے کلام سے واضح ہو گیا کہ اَنْزَلَ اور نَزَّلَ دونوں کا مطلب اُتارا جانا ہے اس لیے یہ دونوں الفاظ قرآن کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں قرآن کے لیے نَزَّلَ کا لفظ لایا گیا ہے وہاں قرآن کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کے کثیر ہونے کا بھی' اور یہ کثرت اس کے بالاقساط اتارے جانے کا بھی تقاضا ہے۔ چونکہ تورات میں بھی یہ کثرت پائی جاتی ہے اس لیے اس کے لیے بھی قرآن میں کم از کم ایک دفعہ ''نَزَّلَ'' کا لفظ لایا گیا ہے۔]

(۲) آیت ۱۱:

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱﴾

''جیسا آلِ فرعون کا حال ہوا اور ان کا جو ان سے پہلے تھے' انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے بھی ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا' اور اللہ سخت سزا دینے والے ہیں۔''

اور سورۃ الانفال کی آیت ۵۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۵۲﴾

''انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا' یقیناً اللہ طاقتور ہیں اور سخت سزا دینے والے ہیں۔''

اور اسی سورت کی آیت ۵۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۵۴﴾

''انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کی بنا پر انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کیا' اور یہ سب ظلم کرنے والے تھے۔''

یہاں پر چھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) آل فرعون کے بارے میں دو جگہ پر كَذَّبُوْا (آل عمران' اور الانفال کی دوسری آیت) اور ایک جگہ پر ''كَفَرُوْا'' (الانفال کی پہلی آیت) لایا گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) ان کی طرف تکذیب کی نسبت تین مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے:

آل عمران میں: بِاٰيٰتِنَا

الانفال میں: بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اور الانفال کی دوسری آیت میں: بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ کہا گیا۔ کیوں؟

(۳) ان کے انجام میں دو مختلف لفظ لائے گئے:

الانفال کی دوسری آیت میں: فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

اور باقی دونوں آیات میں: فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ لایا گیا۔

(۴) آل عمران کی آیت کا اختتام اس جملہ پر ہوا: وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

اور الانفال کی پہلی آیت کا اختتام: اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ پر ہوا۔ اور دوسری آیت میں یہ وصف سرے سے بیان نہیں ہوا۔

(۵) الانفال کی دوسری آیت میں آل فرعون کے عذاب کی تفصیل بیان ہوئی، یعنی ان کے غرق کیے جانے کا ذکر ہوا۔ باقی دونوں آیات میں اس کا تذکرہ نہیں ہوا۔

(۶) سورۃ آل عمران کی آیت کی ابتدا ''كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ'' سے ہوتی ہے، تو شروع کے اس ''کاف'' کا تعلق کس سے ہے؟

یہ سوال ہماری اس کتاب کے موضوع سے تو متعلق نہیں ہے لیکن بطور تتمہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

اب جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل تینوں آسمانی کتابوں کے اتارے جانے کا ذکر تھا اور ان کتابوں میں جو ہدایت اور حق و باطل کے درمیان فرقان کا پہلو تھا، اس کی طرف بھی اشارہ تھا، اس لیے جن لوگوں نے ان کتابوں کا انکار کیا، ان کے لیے تکذیب (كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا) کی تعبیر مناسب تھی۔

اس کے مقابلے میں سورۃ الانفال کی پہلی آیت سے قبل کہیں بھی آسمانی کتب کے اتارے جانے کا ذکر نہیں ہے، ذکر ہے تو مسلمانوں کا اور معاصر کفار عرب کا جن کے ساتھ قتل و قتال کا چرچا ہے، اس لیے یہاں ''كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' کہنا ہی مناسب تھا۔ اور چونکہ اگلی آیت اس کے معاً بعد ہی آ رہی ہے۔ یعنی دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں ہے، اس لیے دوبارہ پھر ''كَفَرُوْا'' کی تکرار نہیں کی گئی، بلکہ ''كَذَّبُوْا'' کا لفظ لایا گیا تاکہ ان کفار کی دونوں خصلتیں (کفر اور تکذیب) ظاہر ہو جائیں۔

(۲) سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں ''اللہ'' کا نام خصوصی طور پر لایا گیا۔ فرمایا: ''كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل فرشتوں کا ذکر ہے اور ان سے ایک فعل منسوب کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾ (آیت ۵۰)

''کاش کہ تو دیکھتا جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور سرینوں پر ضرب لگاتے ہیں۔''

اور شیطان اور اس کے ایک فعل کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾

''اور جب شیطان نے ان کے سامنے ان کے اعمال کو سجا کے پیش کیا۔''

اس کے مقابلے میں سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل غیر اللہ کے نہ کسی فعل کا تذکرہ ہے اور نہ ایسے کسی فعل کی نسبت اللہ کے سوا کسی اور سے کی گئی ہے، اس لیے وہاں اللہ کے اسم ظاہر کے بجائے اللہ کی ضمیر کی طرف نسبت کی گئی، فرمایا ''كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' اور اس اسلوب کو ''التفات'' یعنی توجہ دلانا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الانفال میں اسم ظاہر لایا گیا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ہر امر اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی انہیں نشانیاں دکھانے والا ہے، فعل ہے تو صرف اسی کا ہے، خود فرشتے بھی اس کے امر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، ان کا عمل بھی اللہ ہی

کا پیدا کردہ ہے' اور شیطان کا یہ فعل کہ اس نے کفار کے اعمال کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تقدیر اور مشیت کی بنا پر ہے' یہ سب کچھ اس کا پیدا کردہ ہے' اس کی حکومت کا حصہ ہے' جو بھی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں' سب اسی کی نشانیاں ہیں' اور سب سے اعلیٰ اور ارفع مثال اس کے لائق حال ہے۔

اب رہا سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں ''بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ'' کا ذکر جبکہ پہلی آیت میں ''بِاٰیٰتِ اللّٰہ'' کہا گیا تھا تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس دوسری آیت سے قبل اللہ کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾

(آیت ۵۳)

''اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہے بدلنے والا نہیں ہے' یہاں تک کہ وہ اپنی حالت کو بدل ڈالیں۔''

یہاں نعمت کا تذکرہ ہے' اس لیے ''بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ'' کہہ کر اس مالک اور محسن کے صفاتی نام ''رب'' کا تذکرہ مناسب تھا جس نے انہیں یہ نعمتیں عطا کیں اور پھر اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ سزا کے مستحق ہوئے۔

یہاں اگر صرف ''اللہ'' کا ذکر کیا جاتا تو وہ شدتِ کلام نہ پیدا ہوتی جو اللہ کی ربوبیت کی طرف اشارہ کر کے پیدا ہو رہی ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ غور کرو! وہ ذات کہ جس نے تمہیں ساری نعمتیں عطا کیں' جو تمہارا مالک ہے' تم اس کے احسانات کا بدلہ یوں چکا رہے ہو کہ کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو رہے ہو! اس طرزِ بیان میں ندامت و حسرت کی اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے جس سے یہ لوگ گزریں گے۔

مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ جس شخص نے اللہ کی نعمت کی ناقدری کی اسے اگر یوں کہا جائے کہ ''تم نے اپنے مالک' اپنے محسن' اپنے مربّی کے احسانات کی ناقدری کی ہے'' تو یہ اسلوبِ بیان کیا زیادہ بلیغ نہ ہو گا بہ نسبت یہ کہنے کہ ''تم نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے!''

اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی ابتدا میں جہاں خلائق کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے وہاں ربوبیت کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ﴾ (آیت ۲۱)

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔''

(۳) سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں آل فرعون کے غرق ہونے کا ذکر ہے اور پھر ان کے لیے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا گیا اور پہلی آیت میں بجائے ہلاکت کے ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ ارشاد فرمایا' اور وہ اس لیے کہ کلام میں تکرار نہ ہو اور اس لیے بھی کہ یہاں آل فرعون کی ہلاکت کی تفصیل بتائی جا رہی ہے کہ وہ غرق کیے گئے تھے' اس لیے ہلاکت کا لفظ مناسب تھا' اور پھر آخر میں ﴿وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۝﴾ کہہ کر دونوں فریق (غرق ہونے والے اور اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا بھگتنے والے) کا مجموعی تذکرہ ہو گیا۔

(۴) سورۃ الانفال میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝﴾ کہا گیا' اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل کفار کو مخاطب کرتے ہوئے شیطان کا قول مذکور ہے:

﴿لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (آیت ۴۸)

''آج تمہارے اوپر کوئی غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔''

شیطان کی اس بڑ کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف قوت کا انتساب کیا گیا' جیسے سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا﴾ (آیت ۱۶۵)

''کاش کہ ظلم (یعنی شرک) کرنے والے جانتے جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت صرف اللہ کے پاس ہے۔''

اور چونکہ سورۃ آل عمران کی آیت سے قبل ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لیے صرف ﴿وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۝﴾ کہنے پر اکتفا کیا گیا۔ سورۃ الانفال میں انہی وجوہات کی بنا پر نہ صرف شروع میں ''اِنَّ'' کا اضافہ ہے بلکہ اللہ کے صفاتی نام ''اَلْقَوِیُّ'' کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

(۵) اس سوال کا جواب تیسرے سوال کے جواب کے ضمن میں آ گیا ہے اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ آخری جگہ ہے جہاں قرآن میں آل فرعون کے جھٹلانے اور بوجہ کفر اُن کے پکڑے جانے کا ذکر ہے' اس لیے یہاں ان کا تفصیلی ذکر آ گیا۔ اور خیال رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے ذکر کی گئی ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ترتیب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دخل ہے تو اس کا خیال درست نہیں ہے' ہم اس بات کو سورۃ القمر کے ضمن میں بھی ذکر کریں گے۔

(۶) ﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾

''کاف'' کا تعلق مبتدأ مقدر سے ہے' گویا یوں کہا جا رہا ہے:

دَأبُهُم او دأب هٰؤلاءِ او هذا كدأب آل فرعون

''ان کا' یا ان لوگوں کا' یا ایسا چال چلن آل فرعون کے چال چلن جیسا ہے''

اور جن لوگوں نے اس کی تقدیر ان الفاظ سے کی ہے' جیسے ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ ''یہ لوگ جہنمی ہیں' جیسے آل فرعون'' تو یہ تقدیر قابل قبول نہیں ہے اور الانفال کی دونوں آیتوں میں (جن کی ابتدا كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ) یہ تقدیر انتہائی ضعیف دکھائی دیتی ہے اور معنی بھی صحیح طریقے سے ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ کو اگر مستقل سمجھا جائے اور ماقبل سے اس کے اعراب کا تعلق نہ ہو تو نظم میں سلاست اور معنی میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳) آیت ۲۷:

﴿تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ۫﴾

''تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔''

اور سورۂ یونس کی آیت ۳۱ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾

''پھر کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور زندہ کو مردے سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔''

اور ایسے ہی سورۃ الروم کی آیت ۱۹ میں۔

لیکن سورۃ الانعام کی آیت ۹۵ میں لفظ ''مُخْرِجُ'' آیا ہے یعنی اسم فاعل جو فعل کی جگہ لایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ﴾

''اور اللہ تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے' زندہ کو مردہ سے نکالنے والا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔''

تو اس کا کیا سبب ہے؟

جواباً عرض ہے' اور اللہ بہتر جانتے ہیں' کہ سورۃ الانعام کی اس آیت سے پہلے اسم فاعل لایا گیا ہے' یعنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ اور اگلی آیت میں بھی اسم فاعل لایا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ (آیت ۹۶) ''وہ صبح کو نکالنے والا ہے' اور اس نے رات کو راحت بنایا ہے''۔ اور جب یہ آیت دو اسم فاعل کے درمیان آ رہی ہے تو یہاں بھی ﴿وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ﴾ کہہ کر اسم فاعل لایا گیا' یعنی مُخْرِج کا عطف فَالِق پر ہے اور اس کے بعد بھی ''فَالِقُ الْاِصْبَاح'' ایک دفعہ پھر لایا گیا ہے' لیکن باقی آیات میں اس طرح کا نظم نہیں ہے' اس لیے وہاں اسم فاعل لانے کی ضرورت نہ تھی' واللہ سبحانہ اعلم!

لیکن اگر تم یہ کہو کہ اسی آیت میں ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ کہہ کر فعل لایا گیا ہے حالانکہ اس سے قبل بھی تو اسم فاعل موجود ہے (یعنی ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ اور اس کے بعد بھی اسم فاعل ہے' یعنی ﴿وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ﴾؟

اس کا جواب زمخشری نے خوب دیا ہے کہ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ دراصل ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ کے لیے بطور بیان ہے' کیونکہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنا نباتات سے متعلق ہے' گویا خشک میوہ کا اس طرح پیدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے مردہ سے زندہ کو پیدا کیا جائے۔ خشک چیز بمنزلۂ حیوان ہے' جیسے زمین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ﴾ (الروم:۱۹)

''اور زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔''

یہ وضاحت زمخشری کی حسنات میں سے ہے۔

(۴) آیت ۲۸:

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾﴾

''اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے' اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

اور پھر آیت ۳۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾

''اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے' اور اللہ بندوں پر بہت شفقت کرنے والا ہے۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کرسکتا ہے کہ دونوں آیات کا آخری ٹکڑا کیوں مختلف ہے؟ یعنی ایک آیت کے آخر میں ﴿وَاِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸﴾﴾ آیا اور دوسری آیت میں ﴿وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾ لایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت سے ماقبل کا مضمون اس طرح ہے۔ فرمایا:

﴿لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ﴾ (آیت ۲۸)

''ایمان والے اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست نہ بنائیں۔''

اور پھر اس پر ان الفاظ میں ایک سخت وعید سنائی:

﴿وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ ﴾ (آیت ۲۸)

''اور جو ایسا کرتا ہے تو اللہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں۔''

اور پھر اس میں صرف ایک استثناء رکھا اور وہ تھا حالت خوف کا:

﴿اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡہُمۡ تُقٰىۃً ؕ﴾ (آیت ۲۸)

''سوائے اس کے کہ تم ان سے ڈرتے ہو۔''

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ؕ﴾ ''اور اللہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے آپ سے'' یعنی اس کے عذاب سے۔ اور پھر فرمایا: ﴿وَاِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

گویا تمہارے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔ یہ سارے کا سارا مضمون نگینہ کی مانند زیور میں جڑا ہوا ہے۔ اور پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡہُ یَعۡلَمۡہُ اللّٰہُ ؕ وَیَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۹﴾﴾

''کہہ دیجیے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ بھی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اور یہاں یہ بتا دیا کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ لوگ جو کہ مُردوں کے اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں، اپنا سارا استدلال انہی دونوں صفات (علم اور قدرت) کے انکار پر ٹھہرائے ہوئے ہیں، اور اگر ان دونوں صفات کا اثبات کر دیا جائے تو ان کی دلیل کی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس آیتِ عظیمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت جزئیات کا بھی احاطہ کرتی ہے، اس کے علم اور قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی طرف لوٹنا حق ہے۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ بندوں کے اعمال، چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے، سب کے سب گنے چنے ہیں، فرمایا: ﴿یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ۚ﴾ (آیت ۳۰) ''اُس دن ہر نفس ہر اُس خیر یا شر کو جو اُس نے کیا تھا، حاضر پائے گا''۔ پھر دوبارہ اس بات کا اعادہ کیا: ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ؕ﴾ ''اور اللہ تمہیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے''۔ اور پھر اپنی رحمت و شفقت کا تذکرہ فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾

[یہاں ہم ابن عاشور کی عبارت کا سہارا لیتے ہیں کہ جس سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ مترجم]

پہلی آیت میں اس بات سے ڈرایا ہے کہ کفار سے دوستی نہ کرو اور یہ جو تم تقیہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہو اس میں تساہل نہ کرو، اور چونکہ یہ دونوں باتیں سخت قسم کی ہیں اس لیے آخر میں ﴿وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾﴾ کہا، تاکہ اس ڈرائے جانے کی تاکید ہو جائے، یعنی پھر اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، ایسا کرو گے تو پھر کہاں جاؤ گے؟ اس کے مقابلے میں دوسری آیت میں اپنے اعمال کے، روزِ قیامت سامنے حاضر کیے جانے کا بیان ہے۔ یہاں ڈرائے جانے میں ایک قسم کی نصیحت غالب ہے کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، اور پھر ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾ کہہ کر ایک قسم کی بشارت اہل ایمان کو دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت بے پایاں ہے، تم اپنی طرف سے کوتاہی نہ کرو، واللہ اعلم!

(۵) آیت ۴۰:

حضرت زکریا علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا:

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ﴾

''کہاں سے ہوگا میرا بچہ حالانکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔''

اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ﴿۸﴾﴾

''کہاں سے ہوگا میرا بچہ اور میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔''

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں جگہ بات ایک ہی ہے لیکن سیاق مختلف ہے، تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۂ مریم ابتداءِ سورت سے قصہ مریم تک فواصل آیات (یعنی آیت کا آخری لفظ) ایک جیسے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

﴿ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا ﴿۲﴾﴾

﴿اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ﴿۳﴾﴾

اور پھر یہ فواصل آیات حضرت مریم کے قصے کے آخر تک یوں ہی چلے جاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾﴾

اور پھر آیت ۴۱ سے دوبارہ یہی فواصل شروع ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ﴿۴۱﴾﴾

اور سورت کے آخر تک ایسے ہی چلے جاتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں گو آیت آل عمران کے مقابلے میں تقدیم و تاخیر ہے لیکن فاصلے کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے روا رکھا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کا نظم اس طرح کے ایک فاصلے کا پابند نہیں ہے، اس لیے وہاں جس طرح آیت کو لایا گیا ہے وہی مناسب ہے، واللہ اعلم!

(۶) آیت ۴۱:

حضرت زکریا علیہ السلام کا قول:

﴿رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَةً ؕ﴾

''اے رب میرے لیے ایک نشانی دکھا دے۔''

یعنی بیوی کے حاملہ ہونے پر کوئی نشانی تا کہ یہ اچھی خبر جلد علم میں آ جائے۔تو کہا گیا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ﴾ (آیت ۴۱)

''تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن تک بات نہیں کرو گے مگر اشاروں میں''

اور سورۂ مریم میں اسی قصے کے ضمن میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰﴾ (مریم)

''تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین راتیں صحیح سلامت ہونے کے باوجود لوگوں سے بات نہ کرو گے۔''

تو اس اختلاف کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ مقصود یہ تھا کہ ان کا بات چیت سے روکا جانا تین دن اور تین راتوں کے لیے تھا' اور اس بات کو بالکل واضح کرنے کے لیے ایک جگہ دن کا اور دوسری جگہ رات کا بھی تذکرہ کر دیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے قومِ عاد پر آندھی کے عذاب کا تذکرہ کیا گیا اور وہاں رات اور دن دونوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا' فرمایا:

﴿سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا﴾ (الحاقة:۷)

''اور اسے ان پر لگا تار سات رات اور آٹھ دن مسلّط کیے رکھا۔''

دونوں اوقات کا خاص طور پر ذکر آ گیا تا کہ یہ وہم باقی نہ رہے کہ یہ عذاب صرف دن کے وقت تھا یا صرف رات کے وقت تھا۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کے قصے میں سورۂ آل عمران کی آیت میں دن کا ذکر ہے جس کی مناسبت ''رَمْزًا'' سے ہے۔ ''رمز'' اشارے کو کہتے ہیں کہ بغیر بولے بات کو سمجھنا' اس میں آنکھ اور ہاتھ کا اشارہ بھی آ جاتا ہے اور بقول مجاہد ہونٹوں کا اشارہ بھی شامل ہے' اور یہ تمام اشارے آنکھ سے دیکھنے کے پابند ہیں' اس لیے دن کا ذکر کیا گیا۔ سورۂ مریم کی آیت میں چونکہ ''رمزًا'' کا ذکر نہ تھا اس لیے رات کا ذکر کر دیا' اور ''رمز'' کے بجائے وہ لفظ لایا گیا کہ جس سے راتوں کے برابر ہونے کا مفہوم واضح ہو گیا' یعنی زکریا علیہ السلام بات نہ کر سکیں گے اور اس میں تمام راتیں برابر ہیں۔ یہاں لفظ ''سَوِیًّا'' اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور اعراب کے لحاظ سے وہ ''لَیَال'' کے لیے ''حال'' ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اسے لفظ ''اَلَّا تُكَلِّمَ'' کی ضمیر مخاطب سے بھی حال مان سکتے ہیں اور پھر معنی یہ ہو گا کہ تمہیں بات چیت سے روک دیا گیا ہے حالانکہ نہ تم گونگے ہو گے' نہ کوئی اور بیماری کا شکار ہو گے۔ لفظ ''سَوِیًّا'' کے آخر میں لائے جانے میں آیات کے فواصل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس طرح کے فواصل نہیں ہیں اس لیے وہاں خاص طور پر یہی لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی' اور اس طرح یہ بات عیاں ہو گئی کہ ہر دونوں سورتوں میں مذکورہ الفاظ کا اپنی اپنی جگہ لایا جانا ہی مناسب تھا' واللہ اعلم!

(۷) آیت ۴۸۔۴۹:

﴿وَیُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝۴۸ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ﴾

''اور وہ انہیں کتاب اور حکمت (یعنی) تورات اور انجیل کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں' پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے' اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور مُردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتا ہوں' اور تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ ۚ﴾

''اور جب تم مٹی سے پرندے کی شکل میرے اذن سے بناتے تھے' پھر اس میں پھونکتے تھے تو وہ میرے اذن سے پرندہ بن جاتا تھا' اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے اذن سے اچھا کر دیتے تھے' اور جب تم مُردوں کو میرے اذن سے کھڑا کر دیتے تھے۔''

یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) پہلی آیت میں ضمیر مذکر ہے (فَاَنْفُخُ فِیْهِ) اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث ہے (فَتَنْفُخُ فِیْهَا)

(۲) پہلی آیت میں کلام میں تفصیل ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کی طرف اسم ظاہر سے کی گئی ہے (یعنی بِاِذْنِ اللّٰہ کہا گیا ہے)۔ لیکن دوسری آیت میں کلام مختصر ہے اور چار جگہوں پر ان معجزات کے ضمن میں اللہ کی ضمیر متکلم (بِاِذْنِیْ) کی طرف کی گئی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

پہلا سوال کہ پہلی آیت میں ضمیر مذکر (فِیْهِ) لائی گئی ہے اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث (فِیْهَا) لائی گئی ہے تو زمخشری نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ پہلی آیت میں ضمیر لفظ ''طَیْر'' (پرندے) کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اے عیسیٰ! جو چیز تم پرندے کی شکل میں بنا رہے ہو' تم اس میں پھونکتے ہو' گویا شکل کی ابتدائی حالت (هَیْئَة) کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ اس کی انتہائی شکل یعنی ''طَیْر'' کا اعتبار کر کے ضمیر مذکر لائی گئی اور دوسری آیت میں ضمیر مؤنث لفظ ''هَیْئَةً'' کی طرف لوٹتی ہے' یعنی وہ شکل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی سے بنائی تھی' اور ایسے ہی یہاں ''تَكُوْنُ'' کہہ کر مؤنث کا صیغہ لایا گیا' کیونکہ اس سے مراد ''هَیْئَة'' ہے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ ہر آیت میں اسلوبِ بیان مختلف کیوں ہے' پہلی آیت میں سارا کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے' کلام میں تفصیل ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کے اسم ظاہر کی طرف کی گئی ہے اور دوسری آیت میں کلام میں اختصار ہے اور معجزات کی نسبت اللہ کی ضمیر متکلّم کی طرف کی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو زمخشری کا جواب تھا' ہم مزید کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

ضمیر کا لفظ کی طرف لوٹنا معنی کی طرف لوٹنے کے اعتبار سے اولیٰ ہے' اصل میں ضمیر کاف (كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ) کی طرف لوٹ رہی ہے' کاف ''مثل'' کا بدل ہے' اس لیے یہاں مذکر ضمیر لائی گئی اور سورۃ المائدۃ میں ''کاف'' معنی کے اعتبار سے ''صفت'' کا بدل ہے' اس لیے مؤنث ضمیر لائی گئی۔ اس کی ایک اور مثال لے لیں۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا﴾ (آیت ۳۱)

''اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی۔''

یہاں ''مَنْ'' کے اعتبار سے ''يَقْنُتْ'' میں فعل مضارع کا مذکر کا صیغہ لایا گیا اور پھر معنی کے اعتبار سے کہ یہاں ازواج النبی (رضی اللہ عنہن) کا ذکر ہو رہا ہے ''تَعْمَلْ'' کہہ کر مؤنث کا صیغہ لایا گیا۔ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

اور سورۃ آل عمران چونکہ قرآنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ہے' اس لیے وہاں لفظ کا اعتبار کر کے مذکر کی ضمیر لائی گئی اور سورۃ المائدۃ چونکہ بعد میں ہے اس لیے وہاں معنی کا اعتبار کر کے مؤنث کی ضمیر لائی گئی۔

ایک دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ ذرا سورۂ آل عمران کا سیاق ملاحظہ فرمائیں:

آیت نمبر ۴۴ ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ سے لے کر آیت ۴۹ (فَاَنْفُخُ فِيْهِ) تک کوئی بیس ضمائر آئی ہیں اور سب کی سب مذکر ہیں' اس لیے ''فَاَنْفُخُ فِيْهِ'' میں بھی اسی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے ضمیر مذکر لائی گئی۔

لیکن سورۃ العقود (المائدۃ) میں اس قصے کی ابتدا وَاذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ (آیت ۱۱۰) سے ہو رہی ہے' جہاں پرندے کی شکل بنانا اور پھر اس میں پھونکنے کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں' تو ''نعمت'' کے اعتبار سے یہاں ضمیر مؤنث لائی گئی' اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ اس سیاق میں ضمائر اس کثرت سے نہیں ہیں جیسے آل عمران میں ہیں۔ اور اس اعتبار سے دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر مناسب الفاظ کے ساتھ آئی ہیں۔

دوسرے سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت میں لفظ ''بِاِذْنِيْ'' چار مرتبہ استعمال ہوا ہے اور وہ اس لیے کہ سورۃ آل عمران میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا بیان ہوا ہے وہاں ایک تو مریم سلام علیہا کو بشارت دی جا رہی ہے کہ تمہارے بیٹے کو یہ یہ انعامات دیے گئے اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان معجزات کو اللہ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اپنی قدرت کی بنا پر کیا' بلکہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوا۔

اور سورۃ المائدۃ کی آیت میں مقصود کچھ مختلف ہے' وہاں اصلاً نصاریٰ کے شرک اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے دعوائے الوہیت کی تردید کی جا رہی ہے لیکن اسلوب' عتاب اور سرزنش کا ہے' یعنی مخاطب تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں لیکن کلام سے مقصود نصاریٰ کو تنبیہ کرنا ہے' اور یہ اسلوبِ کلام ہمارے ہاں معروف ہے۔

دیکھئے' ایک آقا اپنے غلام کو' جو اُسے انتہائی پیارا ہے اور جس نے کبھی اس کی نافرمانی نہیں کی' لوگوں کے

سامنے ان الفاظ میں ڈانٹتا ہے: کیا میں نے تمہارے لیے یہ اور وہ نہیں کیا؟ کیا میں نے تمہیں یہ کچھ عطا نہیں کیا؟ اور پھر اپنے چند احسانات اس پر گنوا کر کہتا ہے: کیا یہ سب میرے علاوہ کسی اور نے دیا ہے؟ تم نے فلاں پر احسان کیا تو وہ میرے عطا کردہ مال ہی سے تو تم نے دیا؟ تم نے فلاں دشمن کو زیر کیا تو وہ میری مدد سے ہی ایسا کیا؟ اور یہ سب سنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ اس غلام نے اگر کسی پر احسان کیا ہے یا اپنے کسی دشمن کو زیر کیا ہے تو وہ صرف اور صرف اپنے آقا کی قدرت اور اعانت سے کیا ہے اور پھر جب غلام بھی اس بات کا اعتراف کر لے کہ جو کچھ آقا نے کہا ہے درست ہے' تو اب کسی کو یہ وہم و گمان نہ رہے گا کہ غلام نے سب کچھ خود کیا تھا اور وہ آزادی سے جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔

بالکل اسی انداز میں یہ آیات وارد ہوئی ہیں' عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے' جیسے پرندے کا بنانا' اس میں پھونک مارنا' اندھے اور کوڑھی کو شفایابی سے ہمکنار کرنا' مُردوں کو زندہ کرنا' ان کے ساتھ بار بار چار مرتبہ ''بِاِذْنِی'' لایا گیا تاکہ نصاریٰ جن معجزات کے دیکھے جانے پر گمراہ ہوئے اور تثلیث کے مرتکب ہوئے' ان کی حقیقت واضح ہو سکے اور ان کے انتہائی لغو قول کی تردید ہو سکے۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ﴾ (المؤمنون:۹۱)

''اللہ نے اپنا کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔''

اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ یہ سارے معجزات اللہ کے اذن سے وقوع پذیر ہوئے اور ''باذنی'' کی تکرار سے اس بات کی تاکید ہو گئی کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس بات کی نفی کر دی گئی کہ یہ سارے معجزات ان کا اپنا فعل نہ تھا۔

اور پھر انہی باتوں کی مزید تاکید کے لیے سورۃ المائدۃ کی اگلی آیات لائی گئیں جہاں ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

''اور جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود قرار دے دو؟''

اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ملاحظہ فرمائیے کہ جس سے نصاریٰ کو ڈانٹ پلانا مقصود تھا:

﴿مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

اور پھر اپنے رب کی تنزیہہ اور ان کے افتراءات سے اپنی براءت اور اللہ کے سامنے مکمل عاجزی کا یوں اظہار کیا:

﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ﴾ (آیت ۱۱۶)

اب واضح ہو گیا کہ سورۃ آل عمران کی آیات میں حضرت مریم کو بشارت دینا مقصود ہے اور سورۃ المائدۃ کی آیات میں گو خطاب حضرت عیسیٰؑ سے ہے لیکن مقصود نصاریٰ کی سرزنش ہے' اور اسی وجہ سے دونوں جگہ اندازِ بیان مختلف ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الاعراف

آیات ۱ تا ۱۰

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ
دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴿۵﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ
وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ﴿۷﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ
فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ﴿۹﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا
مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴿۱۰﴾ ع

ع ی ش

عَاشَ يَعِيْشُ (ض) مَعَاشًا: زندہ رہنا' زندگی گزارنا۔ ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴿۱۱﴾﴾ (النبا) ''اور ہم نے بنایا دن کو زندہ رہنے کے لیے۔'' اور عِيْشَةً: ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴿۷﴾﴾ (القارعة) ''تو وہ مَن بھاتی زندگی گزارنے میں ہے۔''

مَعِيْشَةٌ (ج) مَعَايِشُ: زندگی گزارنے کا ذریعہ' سامانِ زندگی۔ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (الزخرف:۳۲) ''ہم نے تقسیم کیا ان کے مابین ان کی زندگی کے سامان کو دنیوی زندگی میں۔''

ق ی ل

قَالَ یَقِیْلُ (ض) قَیْلُوْلَۃً :دوپہر کو آرام کرنا خواہ نیند نہ آئے۔

قَائِلٌ (اسم الفاعل) :دوپہر کو آرام کرنے والا۔زیر مطالعہ آیت ۴۔

مَقِیْلٌ (اسم الظرف) : آرام کرنے کی جگہ۔ ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا﴿۲۴﴾﴾ (الفرقان) ''اور جنت والے اُس دن سب سے بہتر ہوں گے بلحاظ ٹھکانے کے اور سب سے اچھے ہوں گے بلحاظ آرام گاہ کے۔''

ترکیب:

(آیت۲) ''کِتٰبٌ'' کا مبتدا ''ھٰذَا'' محذوف ہے اور یہ نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''اُنْزِلَ اِلَیْكَ'' اس کی خصوصیت ہے۔ ''فَلَا یَکُنْ'' کَانَ تامہ ہے اور ''حَرَجٌ'' اس کا فاعل ہے۔ ''مِنْهُ'' کی ضمیر ''کِتٰبٌ'' کے لیے ہے۔ ''ذِکْرٰی'' حال ہے۔ (آیت۳) ''وَلَا تَتَّبِعُوْا'' کا مفعول ''اَوْلِیَاءَ'' ہے۔ ''تَذَکَّرُوْنَ'' کی تمیز ''قَلِیْلًا'' ہے اور اس کے آگے ''مَا'' اس کو غیر معین کرنے کے لیے ہے۔ (دیکھیں البقرۃ:۲۶' نوٹ ۱) یعنی بہت ہی کم۔ (آیت۴'۵) ''بَیَاتًا'' حال ہے اور اس کے آگے ''ھُمْ قَائِلُوْنَ'' پورا جملہ بھی حال ہے۔ ''فَجَاءَھَا'' میں ''ھَا'' کی ضمیر بستیوں کے لیے ہے جبکہ ''فَجَاءَھُمْ'' میں ''ھُمْ'' کی ضمیر بستی والوں کے لیے ہے۔ (آیت۶) ''اُرْسِلَ'' کا نائب فاعل ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے' اس کا مرجع ''رَسُوْلٌ'' یا ''مُرْسِلٌ'' محذوف ہے۔ (آیت۸) ''ثَقُلَتْ'' اور ''خَفَّتْ'' کا فاعل ''مَوَازِیْنُ'' ہے اور اس کے ساتھ ''ہٗ'' کی ضمیر ''مَنْ'' کی طرف عائد ہے۔

ترجمہ:

الٓمّٓصٓ :ا'ل'م'ص

اُنْزِلَ :اتاری گئی

فَلَا یَکُنْ :پس چاہیے کہ نہ ہو

حَرَجٌ :کوئی تنگی

لِتُنْذِرَ :تاکہ آپؐ خبردار کریں

وَذِکْرٰی :اور نصیحت ہوتے ہوئے

اِتَّبِعُوْا :تم لوگ پیروی کرو

اُنْزِلَ :اتارا گیا

مِّنْ رَّبِّکُمْ :تمہارے رب کی طرف سے

مِنْ دُوْنِهٖٓ :اس کے سوا

قَلِیْلًا مَّا :بہت تھوڑی ہے جو

کِتٰبٌ :(یہ) ایک ایسی کتاب ہے جو

اِلَیْكَ :آپؐ کی طرف

فِیْ صَدْرِكَ :آپؐ کے سینے میں

مِّنْهُ :اس سے

بِهٖ :اس سے

لِلْمُؤْمِنِیْنَ :ایمان لانے والوں کے لیے

مَآ :اس کی جو

اِلَیْكُمْ :تمہاری طرف

وَلَا تَتَّبِعُوْا :اور پیروی مت کرو

اَوْلِیَآءَ :کچھ کارسازوں کی

تَذَکَّرُوْنَ :تم لوگ نصیحت پکڑتے ہو

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ : اور کتنی ہی بستیاں ہیں
فَجَآءَهَا : پھر آئی ان کے پاس
بَيَاتًا : رات ہوتے ہوئے
قَآئِلُوْنَ : دوپہر کو آرام کرنے والے تھے
دَعْوٰىهُمْ : ان کا پکارنا
جَآءَهُمْ : آئی ان کے پاس
اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ
اِنَّا كُنَّا : بے شک ہم ہی تھے
فَلَنَسْئَلَنَّ : تو ہم لازماً پوچھیں گے
اُرْسِلَ : بھیجا گیا
وَلَنَسْئَلَنَّ : اور ہم لازماً پوچھیں گے
فَلَنَقُصَّنَّ : پھر ہم لازماً بیان کریں گے
بِعِلْمٍ : کسی علم سے
غَآئِبِيْنَ : غائب ہونے والے
يَوْمَئِذٍ : اس دن
فَمَنْ : پس وہ
مَوَازِيْنُهٗ : جن کے ترازو
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ : ہی فلاح پانے والے ہیں
خَفَّتْ : ہلکے ہوئے
فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ
خَسِرُوْٓا : گھاٹے میں ڈالا
بِمَا : بسبب اس کے جو
بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں پر
وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ : اور بے شک ہم نے اختیار دیا ہے تم کو
وَجَعَلْنَا : اور ہم نے بنائے
فِيْهَا : اس میں
قَلِيْلًا مَّا : بہت کم ہے جو

اَهْلَكْنٰهَا : ہم نے ہلاک کیا جن کو
بَاْسُنَآ : ہماری سختی
اَوْ هُمْ : یا اس حال میں کہ وہ لوگ
فَمَا كَانَ : تو نہیں تھا
اِذْ : جب
بَاْسُنَآ : ہماری سختی
قَالُوْٓا : وہ کہنے لگے
ظٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والے
الَّذِيْنَ : ان لوگوں سے
اِلَيْهِمْ : جن کی طرف
الْمُرْسَلِيْنَ : بھیجے ہوؤں سے
عَلَيْهِمْ : ان پر
وَّمَا كُنَّا : اور ہم نہیں ہیں
وَالْوَزْنُ : اور تولنا
الْحَقُّ : حق ہے
ثَقُلَتْ : بھاری ہوئے
فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ
وَمَنْ : اور وہ
مَوَازِيْنُهٗ : جن کے ترازو
الَّذِيْنَ : وہ ہیں جنہوں نے
اَنْفُسَهُمْ : اپنے آپ کو
كَانُوْا : وہ لوگ
يَظْلِمُوْنَ : ظلم کرتے تھے
فِي الْاَرْضِ : زمین میں
لَكُمْ : تمہارے لیے
مَعَايِشَ : زندگی کے ساز و سامان
تَشْكُرُوْنَ : تم لوگ حق مانتے ہو

نوٹ ۱: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ ذمہ دار افسر ہو' تم سب سے اپنے اپنے زیر اثر ماتحتوں کے بارے میں پرسش ہوگی۔ بادشاہ سے رعایا کے بارے میں' مرد سے بیوی بچوں کے بارے میں' عورت سے شوہر کے بارے میں اور خادم سے اس کے آقا کے مال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (ابن کثیرؒ)

نوٹ ۲: ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ۚ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکا نہ کھائیں کہ انسان کے اعمال کا کوئی جسم یا حجم نہیں ہوتا تو پھر ان کا وزن کیسے ہوگا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں اسے اللہ تعالیٰ بھی نہ تول سکے' کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے علاوہ آج کل تو وہ چیزیں بھی تولی جاتی ہیں جن کے تولنے کا آج سے پہلے کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ ہوا' ہوا میں نمی' برقی رو' سردی' گرمی وغیرہ تولی جاتی ہیں اور ان کا میٹر ہی ان کی ترازو ہے۔ پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اعمال کو تول کر ہمیں دکھا دے!

وزنِ اعمال کے ضمن میں دوسری الجھن یہ پیش آتی ہے کہ متعدد احادیث میں آیا ہے کہ محشر کی میزان میں سب سے بڑا وزن کلمہ طیبہ کا ہوگا۔ جس کے پاس یہ کلمہ ہوگا وہ سب پر بھاری رہے گا۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مؤمن کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہے خواہ وہ کتنے بھی گناہ کرے۔ لیکن قرآن مجید کی آیات اور دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی نیکیوں اور برائیوں کو تولا جائے گا۔ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ نجات پائے گا اور جس کے گناہوں کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عذاب ہوگا۔

بعض علماء تفسیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا۔ پہلے کفر و ایمان کا وزن جس کے ذریعہ مؤمن اور کافر کا امتیاز کیا جائے گا۔ اس وزن میں جس کے نامہ اعمال میں صرف کلمہ ایمان ہی ہے' اس کا پلڑا بھاری رہے گا اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کر دیا جائے گا۔ پھر دوسرا وزن نیک و بد اعمال کا ہوگا۔ اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں اور کسی کی برائیاں بھاری ہوں گی اور اسی کے مطابق اس کو جزا و سزا ملے گی۔ اس طرح تمام آیات اور احادیث کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۳: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی' جس سے انہوں نے علمِ دین اور احکامِ دین لکھے اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۱ تا ۱۸

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ

خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

ذ ء م

ذَأَمَ يَذْأَمُ (ف) ذَأْمًا :عیب لگانا۔

مَذْءُوْمٌ (اسم المفعول) :عیب لگایا ہوا۔زیر مطالعہ آیت ۱۸۔

د ح ر

دَحَرَ يَدْحَرُ (ف) دُحُوْرًا :کسی کو کہیں سے زبردستی نکالنا' ہانکنا' کھدیرنا۔ ﴿وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوْرًا﴾ (الصّٰفّٰت) ''اوران پر پھینکے جاتے ہیں ہرطرف سے کھدیرتے ہوئے۔''

مَدْحُوْرٌ (اسم المفعول) :ہانکا ہوا' کھدیرا ہوا۔زیر مطالعہ آیت ۱۸

ترکیب

(آیت۱۲)''اَلَّا'' دراصل ''اَنْ لَا'' ہے۔اس میں شامل ''اَنْ'' نے ''تَسْجُدَ'' کو نصب دی ہے۔ (آیت۱۳)''فَاهْبِطْ مِنْهَا'' میں اور آگے ''فِيْهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیریں جنت کے لیے ہیں' حالانکہ ان آیات میں جنت کا ذکر نہیں ہے' لیکن قرآن کے دوسرے مقامات کے مطالعہ سے قرآن کے قاری کے لیے یہ بات معروف ہوجاتی ہے کہ یہ واقعہ جنت کا ہے۔اس لیے جنت کا ذکر کیے بغیر یہاں اس کے لیے ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ (آیت۱۴)''اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ'' میں ''يَوْمِ'' مضاف ہے اور جملہ فعلیہ ''يُبْعَثُوْنَ'' اس کا مضاف الیہ ہے۔ (دیکھیں المائدۃ:۱۱۹' ترکیب)۔ (آیت ۱۶'۱۷) ''لَاَقْعُدَنَّ'' کا مفعول ''صِرَاطَكَ'' ہے۔''لَا تَجِدُ'' کا مفعولِ اوّل ''اَكْثَرَهُمْ'' ہے اور ''شٰكِرِيْنَ'' اس کا مفعول ثانی ہے۔ (آیت ۱۸) ''مَذْءُوْمًا'' اور ''مَدْحُوْرًا'' حال ہیں' اس لیے حالت نصب میں ہیں۔''لَمَنْ'' پر لام تاکید ہے اور ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ ''مِنْكُمْ'' میں ''كُمْ'' کی ضمیر ''مَنْ تَبِعَكَ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ :اور بے شک ہم نے پیدا — ثُمَّ :پھر

کیا تم لوگوں کو

صَوَّرْنٰكُمْ :ہم نے شکل دی تمہیں — ثُمَّ :پھر

قُلْنَا :ہم نے کہا — لِلْمَلٰٓئِكَةِ :فرشتوں سے

اسْجُدُوْا :تم لوگ سجدہ کرو — لِاٰدَمَ :آدمؑ کے لیے

فَسَجَدُوْٓا :تو انہوں نے سجدہ کیا — اِلَّآ :سوائے

اِبْلِيْسَ :ابلیس کے — لَمْ يَكُنْ :وہ نہیں تھا

مِّنَ السّٰجِدِيْنَ :سجدہ کرنے والوں میں سے — قَالَ :(اللہ نے) کہا

مَا : کس چیز نے
اَلَّا تَسْجُدَ : کہ تو سجدہ نہ کرے
اَمَرْتُكَ : میں نے حکم دیا تجھ کو
اَنَا : میں
مِّنْهُ : اس سے
مِنْ نَّارٍ : آگ سے
مِنْ طِيْنٍ : گارے سے
فَاهْبِطْ : پس تو نیچے اُتر
فَمَا يَكُوْنُ : تو نہیں ہے
اَنْ : کہ
فِيْهَا : اس میں
اِنَّكَ : یقیناً تو
قَالَ : (ابلیس نے) کہا
اِلٰى يَوْمِ : اس دن تک (جب)
قَالَ : (اللہ نے) کہا
مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ : مہلت دیے ہوئے میں سے ہے
فَبِمَآ : پس بسبب اس چیز کے جس سے
لَاَقْعُدَنَّ : میں لازماً بیٹھوں گا
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ : تیرے سیدھے راستے پر
لَاٰتِيَنَّهُمْ : میں لازماً آؤں گا ان کے پاس
وَمِنْ خَلْفِهِمْ : اور ان کے پیچھے سے
وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ : اور ان کی بائیں جانبوں سے
اَكْثَرَهُمْ : ان کے اکثر کو
قَالَ : (اللہ نے) کہا
مِنْهَا : اس سے
مَّذْءُوْرًا : کھدیڑا ہوا ہوتے ہوئے

مَنَعَكَ : تجھے روکا
اِذْ : جب (کہ)
قَالَ : (ابلیس نے) کہا
خَيْرٌ : بہتر ہوں
خَلَقْتَنِيْ : تو نے پیدا کیا مجھ کو
وَّخَلَقْتَهٗ : اور تو نے پیدا کیا اس کو
قَالَ : (اللہ نے) کہا
مِنْهَا : اس سے
لَكَ : تیرے لیے
تَتَكَبَّرَ : تو بڑا بنے
فَاخْرُجْ : پس تو نکل
مِنَ الصّٰغِرِيْنَ : حقیر ہونے والوں میں سے ہے
اَنْظِرْنِيْٓ : تو مہلت دے مجھے
يُبْعَثُوْنَ : یہ لوگ اٹھائے جائیں گے
اِنَّكَ : بے شک تو
قَالَ : (ابلیس نے) کہا
اَغْوَيْتَنِيْ : تو نے گمراہ کیا مجھے
لَهُمْ : ان کے لیے
ثُمَّ : پھر
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ : ان کے سامنے سے
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ : اور ان کی داہنی جانبوں سے
وَلَا تَجِدُ : اور تو نہیں پائے گا
شٰكِرِيْنَ : شکر ادا کرنے والا
اخْرُجْ : تو نکل
مَذْءُوْمًا : عیب لگایا ہوا ہوتے ہوئے
لَمَنْ : بے شک جس نے

تَبِعَكَ : پیروی کی تیری | مِنْهُمْ : ان میں سے
لَاَمْلَئَنَّ : تو میں لازماً بھر دوں گا | جَهَنَّمَ : جہنم کو
مِنْكُمْ : تم لوگوں سے | اَجْمَعِيْنَ : سب کے سب سے

نوٹ ۱: تخلیق انسانی کے جس آغاز کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس کی تفصیل کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانے میں سائنس کے نام سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان ایک غیر انسانی حالت سے مختلف مدارج طے کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اس کے برعکس قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے۔ اس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔ وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا ہے۔

انسانیت کی تاریخ کے یہ دو مختلف نقطہ نظر ہیں جن سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور میں انسان دراصل حیوان کی ہی ایک شاخ نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی انسان حیوانات کا سا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو یہ بالکل فطری طرزِ عمل ہوگا۔ اس کے برعکس قرآنی تصور میں انسان کو جانور کے بجائے انسان کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔ اسے حیوانِ ناطق نہیں بلکہ اللہ کا خلیفہ سمجھا جائے گا۔ انسان کو دوسری مخلوقات سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اس کا نُطق (بات کرنے کی صلاحیت) نہیں ہے بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ (تفہیم القرآن سے ماخوذ)

اوپر مولانا مودودیؒ نے کہا ہے کہ دیگر مخلوقات سے انسان کو ممتاز کرنے والی چیز نُطق یعنی بات کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سمجھ لیں۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات سے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ کچھ دیگر مخلوقات کو بھی اللہ تعالیٰ نے نطق کی صلاحیت عطا کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی بات چیت کو یا تو ہم سن نہیں سکتے اور اگر سنتے ہیں تو سمجھ نہیں پاتے۔ مثال کے طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو آتا دیکھ کر ایک چیونٹی نے چیونٹیوں سے کہا تھا کہ تم لوگ اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سلیمانؑ نے نہ صرف اس بات کو سن لیا بلکہ سمجھ بھی لیا۔ اور پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی وہ بھی قرآن مجید میں نقل کی گئی ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ وہ یہ دعا یاد کر لیں (النمل ۱۶ تا ۱۹)۔ اس کے آگے آیت ۲۲ میں ہدہد کا حضرت سلیمان علیہ السلام سے بات کرنے کا بھی ذکر ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ ہر نئے نظریے کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیتے ہیں، پھر دوسروں پر اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کے لیے اس کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ اکثر کے علم میں نہیں ہوتا یا ہم بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو جھوٹا قرار دیا ہے جو سنی سنائی بات کو تحقیق کیے بغیر آگے بڑھا دے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہی ''سائنسی'' نظریات جب مغربی محققین کی سائنٹیفک کسوٹی پر غلط ثابت ہو جاتے ہیں تو اس کا چرچا نہیں ہوتا۔ ایسی تحقیقی باتوں کو عام کرنا مغربی میڈیا کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ اگر چپ سادھ لیتے ہیں تو ان سے شکایت بے سود ہے۔

یہ مسلمان اہل علم کی ذمہ داری ہے جس سے ہم کما حقّہٗ عہدہ برآ نہیں ہو رہے ہیں۔ مغرب میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو دفن ہوئے برسوں گزر چکے ہیں' لیکن ہم لوگ اسے آج تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

نوٹ ۲: ایسی حالت میں کہ جب اللہ تعالیٰ ابلیس پر غضب فرما رہا تھا' اس نے اللہ سے دعا مانگی کہ مجھے قیامت تک مہلت دے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی سن لی۔ اس سے قبولیت دعا کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم اور حکمت کے تحت جس کی چاہتا ہے' دعا قبول کرتا ہے' خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر۔ اس لیے کسی کی دعا کا قبول ہونا اس کے قربِ الٰہی کی سند نہیں ہے۔

آیات ۱۹ تا ۲۵

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

وسوس

وَسْوَسَ يُوَسْوِسُ (رباعی) وَسْوَسَةً: کسی کے ذہن میں برا خیال ڈالنا' زیر مطالعہ آیت ۲۰۔

وَسْوَاسٌ (اسم ذات): برا خیال۔ ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾﴾ (الناس) ''پیچھے ہٹنے والے برے خیال کی برائی سے۔''

نصح

نَصَحَ يَنْصَحُ (ف) نُصْحًا: کوئی ایسی بات یا کام کرنا جس میں دوسرے کی بھلائی ہو اور اپنی کوئی غرض نہ ہو۔ (۱) خیر خواہی کرنا۔ (۲) خالص ہونا' صاف ہونا۔ ﴿لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ﴾ (الاعراف:۷۹) ''بے شک میں پہنچا چکا ہوں اپنے رب کے پیغام کو اور میں نے خیر خواہی کی ہے تمہارے لیے۔'' ﴿وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ﴾ (التوبۃ:۹۱) ''اور ان لوگوں پر جو نہیں پاتے اس کو جو وہ خرچ کریں' کوئی حرج نہیں ہے جب وہ لوگ دل سے صاف ہوئے اللہ کے لیے اور اُس کے رسول کے لیے۔''

نُصْحٌ (اسم ذات بھی ہے) : بے لوث خیر خواہی۔ ﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ﴾ (ھود:٣٤) ''اور تم کو نفع نہیں دے گی میری بے لوث خیر خواہی۔''

نَاصِحٌ (اسم الفاعل) : خیر خواہی کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۱۔

نَصُوْحٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ) : بے انتہا خالص۔ ﴿تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ﴾ (التحریم:٨) ''تم لوگ توبہ کرو اللہ سے بے انتہا خالص توبہ۔''

ط ف ق

طَفِقَ يَطْفَقُ (س) طَفَقًا : کسی کام کو شروع کرنے یا کرنے لگنے کا مفہوم دیتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲

خ ص ف

خَصَفَ يَخْصِفُ (ض) خَصْفًا : سینا' ٹانکنا' چپکانا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲۔

ترکیب:

(آیت ۱۹) ''فَتَكُوْنَا'' کا فا سببیہ ہے' اس لیے نون اعرابی گرا ہوا ہے۔ (آیت ۲۰) ''وُرِيَ'' مادہ ''وری'' سے باب مفاعلہ کا ماضی مجہول ''وُوْرِيَ'' ہے جس کو ''وُرِيَ'' لکھتے ہیں۔ (آیت ۲۲' ۲۳) ''لَمْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''اَقُلْ'' مجزوم ہے۔ اسی طرح ''لَمْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''تَرْحَمْنَا'' مجزوم ہے۔

ترجمہ:

وَيٰٓاٰدَمُ : اور اے آدمؑ	اسْكُنْ : سکونت اختیار کرو
اَنْتَ : تم	وَزَوْجُكَ : اور تمہاری بیوی
الْجَنَّةَ : اس باغ میں	فَكُلَا : پھر تم دونوں کھاؤ
مِنْ حَيْثُ : جہاں سے	شِئْتُمَا : تم دونوں چاہو
وَلَا تَقْرَبَا : اور تم دونوں قریب مت جانا	هٰذِهِ الشَّجَرَةَ : اس درخت کے
فَتَكُوْنَا : ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے	مِنَ الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والوں سے
فَوَسْوَسَ : پھر برا خیال ڈالا	لَهُمَا : ان کے لیے
الشَّيْطٰنُ : شیطان نے	لِيُبْدِيَ : تاکہ وہ ظاہر کرے
لَهُمَا : ان کے لیے	مَا : اس کو جو
وُرِيَ : چھپایا گیا	عَنْهُمَا : ان دونوں سے
مِنْ سَوْاٰتِهِمَا : ان کے ستروں میں سے	وَقَالَ : اور اُس نے کہا
مَا نَهٰىكُمَا : تم دونوں کو نہیں روکا	رَبُّكُمَا : تمہارے رب نے
عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ : اس درخت سے	اِلَّآ : مگر (اس لیے)
اَنْ : کہ (کہیں)	تَكُوْنَا : تم دونوں ہو جاؤ

مَلَکَیْنِ :فرشتے
تَکُوْنَا :تم دونوں ہو جاؤ
وَقَاسَمَھُمَآ :اور اُس نے دونوں کو قسم دی
لَکُمَا :تم دونوں کے لیے
فَدَلّٰھُمَا :تو اس نے پھسلا دیا دونوں کو
فَلَمَّا :پھر جب
الشَّجَرَۃَ :اس درخت کو
لَھُمَا :ان کے لیے
وَطَفِقَا :اور وہ دونوں لگے
عَلَیْھِمَا :اپنے اوپر
وَنَادٰھُمَا :اور پکارا ان دونوں کو
اَلَمْ اَنْھَکُمَا: کیا میں نے روکا نہیں تھا تم دونوں کو
وَاَقُلْ :اور میں نے کہا نہیں تھا
اِنَّ :کہ
لَکُمَا :تم دونوں کا
قَالَا :ان دونوں نے کہا
ظَلَمْنَآ :ہم نے ظلم کیا
وَاِنْ :اور اگر
لَنَا :ہم کو
لَنَکُوْنَنَّ :تو ہم لازماً ہو جائیں گے
قَالَ :(اللہ نے) کہا
بَعْضُکُمْ :تم میں کا کوئی
عَدُوٌّ :دشمن ہے
فِی الْاَرْضِ :زمین میں
وَّمَتَاعٌ :اور برتنے کا کچھ سامان ہے
قَالَ :(اللہ نے) کہا

اَوْ :یا
مِنَ الْخٰلِدِیْنَ :ہمیشہ رہنے والوں میں سے
اِنِّیْ :بے شک میں
لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ :یقیناً خیر خواہی کرنے والوں میں سے ہوں
بِغُرُوْرٍ :فریبوں سے
ذَاقَا :دونوں نے چکھا
بَدَتْ :تو ظاہر ہو گئے
سَوْاٰتُھُمَا :ان کے ستر
یَخْصِفٰنِ :چپکانے
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ :باغ کے پتوں میں سے
رَبُّھُمَآ :ان کے رب نے
عَنْ تِلْکُمَا الشَّجَرَۃِ :اس درخت سے
لَّکُمَآ :تم دونوں سے
الشَّیْطٰنَ :شیطان
عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ :ایک کھلا دشمن ہے
رَبَّنَا :اے ہمارے ربّ
اَنْفُسَنَا :اپنی جانوں پر
لَّمْ تَغْفِرْ :تو نے معاف نہ کیا
وَتَرْحَمْنَا :اور تو نے رحم نہ کیا ہم پر
مِنَ الْخٰسِرِیْنَ: گھاٹا پانے والوں میں سے
اھْبِطُوْا :تم لوگ نیچے اُترو
لِبَعْضٍ :کسی کے لیے
وَلَکُمْ :اور تمہارے لیے
مُسْتَقَرٌّ :ایک ٹھکانہ ہے
اِلٰی حِیْنٍ :کچھ عرصہ تک
فِیْھَا :اس میں

تَحْيَوْنَ :تم لوگ زندہ رہو گے
تَمُوْتُوْنَ :تم لوگ مرو گے
تُخْرَجُوْنَ :تم لوگ نکالے جاؤ گے

وَفِيْهَا :اوراس میں
وَمِنْهَا :اوراس میں سے

نوٹ۱: گزشتہ چند آیات میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے' اس کے مطالعہ سے چند اہم حقائق واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

(۱) انسان کے اندر شرم وحیا کا ایک فطری جذبہ ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے پیدا نہیں ہوئی ہے' جیسا کہ بعض مغربی مفکرین نے قیاس کیا ہے' بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا جبکہ انسان نے اپنی بڑائی کا خود دعویٰ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی ہے۔ (یعنی جو انسان خود اپنی بڑائی کا دعویٰ کرے وہ دراصل شیطان کا شاگرد ہے' کیونکہ یہ انسانی نہیں بلکہ شیطانی عمل ہے۔ مرتّب)

(۳) شیطان نے خالص غرور اور تکبّر کی بنا پر اللہ کی نافرمانی کی' جبکہ انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔

(۴) انسان نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعیٔ شر کو داعیٔ خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں گیا کہ یہ راستہ اسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔

(۵) عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے بی بی حوا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا' پھر انہیں حضرت آدمؑ کو ورغلانے کا آلۂ کار بنایا' قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکہ دیا اور دونوں اس سے دھوکہ کھا گئے۔

(۶) شیطان اپنے قصور کا اعتراف کرنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا' جبکہ انسان نے اپنے قصور کا اعتراف کیا' اس پر نادم ہوا اور معافی مانگی اور اسے معاف کر دیا گیا۔

(۷) اس لیے جو انسانی راہ مطلوب ومحمود ہے اسے شیطانی راہ سے بالکل الگ کر کے واضح کر دیا گیا۔ اب یہ ہر انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لیے انسانی راہ کو منتخب کرتا ہے یا شیطانی راہ اختیار کرتا ہے۔ (تفہیم القرآن سے ماخوذ)

نوٹ۲: جنت سے نیچے اترنے کا خطاب حضرت آدمؑ' بی بی حوا اور ابلیس سے تھا (اس لیے یہاں تثنیہ کے بجائے جمع کا صیغہ آیا ہے۔ مرتّب) مفسّرین نے ان مقامات کا بھی ذکر کیا ہے جہاں ان میں سے ہر ایک پھینکا گیا تھا' لیکن یہ ساری خبریں اسرائیلیات سے لی گئی ہیں۔ ان کی صحت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ اگر ان مقامات کے تعین میں کوئی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا ضرور ذکر فرماتا یا حدیث میں کہیں مذکور ہوتا۔ (ابن کثیر)

آیات ۲۶ تا ۳۰

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ
مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا
تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا
وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۫ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝۲۹ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ
اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

ر ی ش

رَاشَ يَرِيْشُ (ض) رَيْشًا : کسی کے حال کی اصلاح کرنا۔
رِيْشٌ (اسم جنس) : واحد رِيْشَةٌ جمع رِيَاشٌ ۔ پرندوں کے پر۔ آرائش وزیبائش کی کوئی بھی چیز۔ زیر مطالعہ آیت ۲۶۔

ب د ء

بَدَأَ يَبْدَأُ (ف) بَدْأً : کسی کام کی ابتدا کرنا' پہل کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۹۔
اَبْدَأَ (افعال) اِبْدَاءً: ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہے۔ ابتدا کرنا۔ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ﴾ (العنکبوت:۱۹) ''تو کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ کیسے ابتدا کرتا ہے تخلیق کی۔''

ترکیب:

(آیت ۲۶) ''لِبَاسًا'' نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''يُوَارِيْ'' اس کی خصوصیت ہے اور ''رِيْشًا'' حال ہے۔
(آیت ۲۷) ''يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا'' پر پورا جملہ ''اَخْرَجَ'' کا حال ہے۔ ''اِنَّهٗ'' کی ضمیر شیطان کے لیے بھی مانی جا سکتی ہے اور اسے ضمیر الشان بھی مانا جا سکتا ہے۔ ہماری ترجیح یہ ہے کہ اسے ضمیر الشان مانا جائے۔
(آیت ۲۹) ''مَسْجِدٍ'' ظرفِ مکان اور ظرفِ زمان' دونوں معنی دیتا ہے۔ ہم ظرفِ زمان سے ترجمہ کریں گے۔ اسم الفاعل ''مُخْلِصِيْنَ'' حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس نے فاعل کا کام کیا ہے اور ''اَلدِّيْنَ'' کو نصب دی ہے۔ (آیت ۳۰) پہلا ''فَرِيْقًا'' مفعول ہے ''هَدٰى'' کا۔ دوسرا ''فَرِيْقًا'' بھی مفعول ہے اور اس کا فعل ''اَضَلَّ'' محذوف ہے۔ ''وَيَحْسَبُوْنَ'' کا واو حالیہ ہے۔

ترجمہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ : اے آدمؑ کے بیٹو — قَدْ اَنْزَلْنَا : ہم نے اتارا ہے

عَلَيْكُمْ :تم لوگوں پر
يُّوَارِيْ :چھپاتا ہے
وَرِيْشًا :اورزیبائش ہوتے ہوئے
ذٰلِكَ :وہ (تو)
ذٰلِكَ :یہ
لَعَلَّهُمْ :شاید وہ لوگ
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ :اے آدمؑ کے بیٹو
الشَّيْطٰنُ :شیطان
اَخْرَجَ :اس نے نکالا
مِّنَ الْجَنَّةِ :جنت سے
عَنْهُمَا :ان دونوں سے
لِيُرِيَهُمَا :تاکہ وہ دکھائے دونوں کو
اِنَّهٗ :حقیقت یہ ہے کہ
هُوَ :وہ
مِنْ حَيْثُ :وہاں سے جہاں
اِنَّا :بے شک
الشَّيٰطِيْنَ :شیطانوں کو
لِلَّذِيْنَ :ان کے لیے جو
وَاِذَا :اور جب کبھی
فَاحِشَةً :کوئی بے حیائی
وَجَدْنَا :ہم نے پایا
اٰبَآءَنَا :اپنے اجداد کو
اَمَرَنَا :حکم دیا ہم کو
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
لَا يَاْمُرُ :حکم نہیں دیتا
اَ :کیا
عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر
لَا تَعْلَمُوْنَ :تم لوگ نہیں جانتے

لِبَاسًا :ایک ایسا لباس جو
سَوْاٰتِكُمْ :تمہارے ستروں کو
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى :اور تقویٰ کا لباس!
خَيْرٌ :سب سے بہتر ہے
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ :اللہ کی نشانیوں میں سے ہے
يَذَّكَّرُوْنَ :نصیحت پکڑیں
لَا يَفْتِنَنَّكُمُ :ہرگز لغزش نہ دے تم کو
كَمَآ :جیسے کہ
اَبَوَيْكُمْ :تمہارے والدین کو
يَنْزِعُ :اس حال میں کہ اس نے کھینچ اتارا
لِبَاسَهُمَا :دونوں کا لباس
سَوْاٰتِهِمَا :ان کے ستروں کے حصے
يَرٰىكُمْ :دیکھتا ہے تم لوگوں کو
وَقَبِيْلُهٗ :اور اس کا قبیلہ
لَا تَرَوْنَهُمْ :تم نہیں دیکھتے ان کو
جَعَلْنَا :ہم نے بنایا
اَوْلِيَآءَ :دوست
لَا يُؤْمِنُوْنَ :ایمان نہیں لاتے
فَعَلُوْا :وہ لوگ کرتے ہیں
قَالُوْا :تو کہتے ہیں
عَلَيْهَآ :اس پر
وَاللّٰهُ :اور اللہ نے
بِهَا :اس کا
اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
بِالْفَحْشَآءِ :بے حیائیوں کا
تَقُوْلُوْنَ :تم لوگ کہتے ہو
مَا :وہ جو
قُلْ :آپؐ کہیے

اَمَرَ :حکم دیا
بِالْقِسْطِ :انصاف کا
اَقِیْمُوْا :تم لوگ سیدھا رکھو
عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ :ہر سجدہ کرنے کے وقت پر
مُخْلِصِیْنَ: خالص کرنے والا ہوتے ہوئے
الدِّیْنَ :کُل دین کو
بَدَاَکُمْ :اس نے ابتدا کی تمہاری
فَرِیْقًا :ایک فریق کو
وَفَرِیْقًا: اور ایک فریق کو (اس نے گمراہی دی)
عَلَیْھِمُ :ان پر
اِنَّھُمُ :بے شک انہوں نے
الشَّیٰطِیْنَ :شیطانوں کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ :اللہ کے علاوہ
یَحْسَبُوْنَ :سمجھتے ہوئے
مُّھْتَدُوْنَ :ہدایت یافتہ ہیں

رَبِّیْ :میرے رب نے
وَ :اور (یہ کہ)
وُجُوْھَکُمْ :اپنے چہروں کو
وَّادْعُوْہُ :اور پکارو اُس کو
لَہُ :اُس کے لیے
کَمَا :جیسے
تَعُوْدُوْنَ :(ویسے ہی) تم لوگ لوٹو گے
ھَدٰی :اس نے ہدایت دی
حَقَّ :(کیونکہ) ثابت ہوئی
الضَّلٰلَۃُ :گمراہی
اتَّخَذُوا :بنایا
اَوْلِیَآءَ :دوست
وَ :اس حال میں کہ
اَنَّھُمْ :کہ وہ

آیات ۳۱ تا ۳۴

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ ھِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا خَالِصَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

ترکیب:

(آیت ۳۲) ''زِیْنَۃَ اللّٰہِ'' اور ''اَلطَّیِّبٰتِ'' دونوں ''حَرَّمَ'' کے مفعول ہیں' اس لیے دونوں حالت نصب میں ہیں۔ ''خَالِصَۃً'' حال ہے۔ ''یَوْمَ'' ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ ''لِقَوْمٍ'' نکرہ مخصوصہ ہے۔ (آیت ۳۳) ''اَلْفَوَاحِشَ' اَلْاِثْمَ'' اور ''اَلْبَغْیَ'' یہ سب ''حَرَّمَ'' کے مفعول ہیں' جبکہ ''اَنْ تُشْرِکُوْا'' اور ''اَنْ تَقُوْلُوْا'' سے پہلے ''حَرَّمَ'' محذوف ہے۔ ''سَاعَۃً'' تمیز ہے۔

ترجمہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ :اے آدمؑ کے بیٹو
زِيْنَتَكُمْ :اپنی زینت کو
وَّكُلُوْا :اور کھاؤ
وَلَا تُسْرِفُوْا :اور حد سے تجاوز مت کرو
لَا يُحِبُّ :پسند نہیں کرتا
قُلْ :آپؐ کہیے
حَرَّمَ :حرام کیا
اَخْرَجَ :اُس نے نکالی
وَالطَّيِّبٰتِ :اور پاکیزہ چیزوں کو
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
لِلَّذِيْنَ :ان لوگوں کے لیے ہے جو
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :دنیوی زندگی میں
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ :قیامت کے دن
نُفَصِّلُ :ہم کھول کھول کر بتاتے ہیں
لِقَوْمٍ :ایسے لوگوں کے لیے جو
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
حَرَّمَ :حرام کیا
الْفَوَاحِشَ :بے حیائیوں کو
مِنْهَا :اس سے
وَالْاِثْمَ :اور گناہ کو
بِغَيْرِ الْحَقِّ :حق کے بغیر
تُشْرِكُوْا :تم لوگ شریک کرو
مَا :اس کو
بِهٖ :جس کی
وَّاَنْ :اور (اس نے حرام کیا) کہ
عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر
لَا تَعْلَمُوْنَ :تم لوگ علم نہیں رکھتے
اَجَلٌ :ایک وقت ہے

خُذُوْا :تم لوگ پکڑو
عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ :ہر سجدہ کرنے کے وقت پر
وَاشْرَبُوْا :اور پیو
اِنَّهٗ :بے شک وہ
الْمُسْرِفِيْنَ :حد سے تجاوز کرنے والوں کو
مَنْ :کس نے
زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ :اللہ کی اس زینت کو جو
لِعِبَادِهٖ :اپنے بندوں کے لیے
مِنَ الرِّزْقِ :رزق میں سے
هِيَ :یہ
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
خَالِصَةً :(لیکن) خالص ہوتے ہوئے
كَذٰلِكَ :اس طرح
الْاٰيٰتِ :آیتوں کو
يَّعْلَمُوْنَ :علم رکھتے ہیں
اِنَّمَا :کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
رَبِّيَ :میرے رب نے
مَا ظَهَرَ :جو نمایاں ہوا
وَمَا بَطَنَ :اور جو پوشیدہ رہا
وَالْبَغْيَ :اور زیادتی کرنے کو
وَاَنْ :اور (اس نے حرام کیا) کہ
بِاللّٰهِ :اللہ کے ساتھ
لَمْ يُنَزِّلْ :اس نے اتاری نہیں
سُلْطٰنًا :کوئی سند
تَقُوْلُوْا :تم لوگ کہو
مَا :وہ جس کا
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ :اور ہر ایک امت کے لیے
فَاِذَا :پھر جب

جَآءَ : آ جائے　　　　اَجَلُهُمْ : ان کا وقت

لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ : تو وہ لوگ پیچھے نہیں ہوں گے　　　　سَاعَةً : ایک گھڑی (یعنی لمحہ بھر بھی)

وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ : اور نہ ہی آ گے ہوں گے

نوٹ ۱: ایک عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں کا استعمال قربِ الٰہی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لیے کوئی جوگی بنتا ہے‘ کوئی رہبانیت اختیار کرتا ہے اور کچھ صوفی بھی ان کی نقل کرتے ہیں۔ لیکن اسلام اس سے منع کرتا ہے‘ کیونکہ یہ سب چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ہی پیدا کی ہیں۔ اصول یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب حلال ہیں‘ جب تک کسی چیز کا حرام ہونا دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصلاً تو یہ چیزیں اہلِ ایمان کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں‘ لیکن اس دنیا میں کافروں کو بھی ان سے استفادہ کرنے کی اجازت ہے‘ کیونکہ یہ دنیا دارالجزاء نہیں ہے بلکہ دارالامتحان ہے۔ البتہ قیامت میں یہ چیزیں صرف اہلِ ایمان کے لیے ہوں گی۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو دلیل شرعی کے بغیر اپنے اوپر حرام کرنا منع ہے‘ وہیں ان کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنا بھی منع ہے۔ اسراف کا مطلب ہے کسی جائز ضرورت پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا۔ مثلاً کھانے میں متعدد ڈشوں کا اور سویٹ ڈش میں ایک سے زائد ڈشوں کا اہتمام کرنا‘ یا بھوک سے زیادہ کھانا یا بھوک کے بغیر کھانا‘ جیسے in between the meals بسکٹوں یا اسنیکس کا اہتمام کرنا وغیرہ۔ اسی طرح کپڑے‘ جوتے اور رہائش کی دوسری ضروریات پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے اور ایسا کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

نوٹ ۲: اثم وہ خطائیں ہیں جو فاعل کی اپنی ذات سے متعلق ہیں اور بغی وہ زیادتی ہے جو دوسروں کے ساتھ کی جائے (ابن کثیر)۔ بغی میں حق کے بغیر کا مفہوم از خود شامل ہے‘ کیونکہ زیادتی کہتے ہی اس کو ہیں جو حق کے بغیر ہو۔ آیت میں بِغَيْرِ الْحَقِّ کا اضافہ تاکید کے لیے کیا گیا ہے۔ جیسے اردو لفظ ’’دیکھنا‘‘ میں آنکھوں سے دیکھنے کا مفہوم از خود شامل ہے‘ لیکن جب تاکید مقصود ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم)

نوٹ ۳: یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افراد اور اقوام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے ’’اجل‘‘ کے پیمانے الگ الگ رکھے ہیں۔ افراد کے پیمانے تو سالوں‘ مہینوں‘ دنوں‘ گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے پورے ہوتے ہیں۔ جب وہ پورے ہو جاتے ہیں تو فرد ختم ہو جاتا ہے‘ جبکہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ اخلاقی زوال کی ایک خاص حد ہے۔ کوئی قوم جب گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم اسی طرح قوموں کے فنا ہونے کے وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ (تدبر قرآن)

البتہ کسی فرد کے بالوں کی سفیدی‘ اعضاء کی کمزوری‘ چہرے کی جھریاں وغیرہ ایسی علامات ہیں جن کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس فرد کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ اسی طرح قوموں کی اخلاقی گراوٹ کی کچھ علامات ہیں جنہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔ ایسی علامات کے ظہور کی ابتداء عموماً اس

وقت ہوتی ہے جب وہ قوم فوجی ساز وسامان اور طاقت کے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس دنیا میں اس کا کوئی مدمقابل باقی نہیں رہتا اور اسے نظر آتا ہے کہ اب وہ جو چاہے کرے' اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ (سورۃ العلق' آیات ۶' ۷)۔ پھر طاقت کے نشے میں اسے ہر نقشہ الٹا نظر آتا ہے۔ ''مجنوں نظر آتی ہے' لیلیٰ نظر آتا ہے''۔ پھر وہ ایسی اخلاقی اقدار کو اپنے پاؤں تلے روندنا شروع کرتی ہے جن کی کبھی وہ خود علمبردار تھی۔ پھر وہ صرف دھاندلی نہیں کرتی بلکہ پوری ڈھٹائی اور بے حیائی سے کرتی ہے اور اسے اپنا حق سمجھتی ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی یہ پستی اس کے سفینے میں سوراخ کرتی رہتی ہے اور وہ قوم اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودتی رہتی ہے۔ مثلاً موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون کے دربار میں مطالبہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور ان کو عذاب دینے کا سلسلہ ختم کردو۔ (سورۂ طٰہٰ' آیت ۴۷)۔ اس وجہ سے فرعون نے ان پر جادوگر ہونے' آج کل کی اصطلاح میں دہشت گرد ہونے کا الزام لگایا اور اپنی قوم کو بتایا کہ یہ دونوں چاہتے ہیں کہ تم لوگوں کو تمہاری زمین سے نکال دیں اور تمہاری بے مثال تہذیب و تمدن کا ستیاناس کر دیں ۔ (سورۂ طٰہٰ' آیت ۶۳) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اس سرزمین سے بنی اسرائیل کو نکال کر لے جانا چاہتے تھے اور اس کے بعد فرعونیوں کی تہذیب سے ان کا کوئی واسطہ نہ رہتا۔ اس طرح معمولی سمجھ بوجھ کا ہر آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ فرعون کا الزام کتنا بے بنیاد اور کیسی دھاندلی پر مبنی تھا۔ لیکن طاقت کے نشہ کا یہ عالم تھا کہ قوم نے اس الزام کو درست تسلیم کیا۔ اخلاقی گراوٹ کی یہ وہ حد ہے جسے عبور کرنے کے بعد وہ قوم اس زمین پر ایک قوم کی حیثیت سے رہنے کے حق سے محروم ہوگئی اور انہوں نے اپنی بے مثال تہذیب کو اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ!

آیات ۳۵ تا ۳۹

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ
یَنَالُهُمْ نَصِیْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَیْنَ مَا كُنْتُمْ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ
ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ
لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا
فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ
لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

ترکیب:

(آیت ۳۵) ''اِمَّا'' دراصل ''اِنْ مَا'' ہے۔ اس میں ''اِنْ'' شرطیہ ہے اور ''مَا'' تاکید کا ہے۔

(البقرۃ:۳۸ ترکیب) ''یَقُصُّوْنَ'' حال ہے ''رُسُلٌ'' کا۔ ''اِمَّا'' کا جوابِ شرط ''فَمَنِ اتَّقٰی'' ہے اور یہ خود بھی شرط ہے' اس کا جوابِ شرط ''فَلَاخَوْفٌ'' ہے۔ (آیت ۳۷) ''رُسُلُنَا'' میں ''رُسُلٌ'' عاقل کی جمع مکسر ہے۔ اس لیے اس کے لیے مؤنث کا صیغہ ''جَاءَ تْ'' اور مذکر کا صیغہ ''یَتَوَفَّوْنَ'' دونوں جائز ہیں۔ ''اُمَمٍ'' نکرہ مخصوصہ ہے۔ ان آیات میں شرط اور جوابِ شرط کی وجہ سے افعال ماضی کا ترجمہ حال یا مستقبل میں کیا جائے گا۔

ترجمہ:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ :اے آدمؑ کے بیٹو	اِمَّا :اگر کبھی
یَاْتِیَنَّکُمْ :تمہارے پاس آئیں	رُسُلٌ : کچھ رسول
مِّنْکُمْ :تم میں سے	یَقُصُّوْنَ :بیان کرتے ہوئے
عَلَیْکُمْ :تم پر	اٰیٰتِی :میری آیات کو
فَمَنِ :تو جو	اتَّقٰی :تقویٰ کرے گا
وَاَصْلَحَ :اور اصلاح کرے گا (اپنی)	فَلَا خَوْفٌ :تو کوئی خوف نہیں ہوگا
عَلَیْھِمْ :ان پر	وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ:اور نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے
وَالَّذِیْنَ :اور جنہوں نے	کَذَّبُوْا :جھٹلایا
بِاٰیٰتِنَا :ہماری آیات کو	وَاسْتَکْبَرُوْا :اور استکبار کیا
عَنْھَآ :ان سے	اُولٰٓئِکَ :وہ لوگ
اَصْحٰبُ النَّارِ: آگ والے ہیں	ھُمْ :وہ لوگ
فِیْھَا :اس میں	خٰلِدُوْنَ :ہمیشہ رہنے والے ہیں
فَمَنْ :تو کون	اَظْلَمُ :زیادہ ظالم ہے
مِمَّنِ :اس سے جس نے	افْتَرٰی :گھڑا
عَلَی اللّٰہِ :اللہ پر	کَذِبًا :ایک جھوٹ
اَوْ :یا	کَذَّبَ :جھٹلایا
بِاٰیٰتِہٖ :اس کی آیات کو	اُولٰٓئِکَ :وہ لوگ ہیں
یَنَالُھُمْ : پہنچے گا جن کو	نَصِیْبُھُمْ :ان کا حصہ
مِّنَ الْکِتٰبِ : لکھے میں سے	حَتّٰٓی :یہاں تک کہ
اِذَا :جب	جَآءَ تْھُمْ :آئیں گے ان کے پاس
رُسُلُنَا :ہمارے پیغامبر (فرشتے)	یَتَوَفَّوْنَھُمْ :ان کو پورا پورا لیتے ہوئے (یعنی روح قبض کرتے ہوئے)

قَالُوْٓا : تو وہ کہیں گے
مَا : وہ، جس کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ
ضَلُّوْا : وہ گم ہو گئے
وَشَهِدُوْا : اور گواہی دیں گے
اَنَّهُمْ : کہ وہ لوگ
كٰفِرِيْنَ : کفر کرنے والے
ادْخُلُوْا : تم لوگ داخل ہو جاؤ
قَدْ خَلَتْ : جو گزر چکی ہے
مِّنَ الْجِنِّ : جنوں میں سے
فِي النَّارِ : آگ میں
دَخَلَتْ : داخل ہوتی ہے
لَّعَنَتْ : تو لعنت کرتی ہے
حَتّٰٓى : یہاں تک کہ
ادَّارَكُوْا : وہ لوگ آ ملیں گے
جَمِيْعًا : سب کے سب
اُخْرٰىهُمْ : ان کی دوسری
رَبَّنَا : اے ہمارے رب
اَضَلُّوْنَا : جنہوں نے گمراہ کیا ہم کو
عَذَابًا ضِعْفًا : دوگنا عذاب
قَالَ : وہ (یعنی اللہ) کہے گا
ضِعْفٌ : دوگنا ہے
لَّا تَعْلَمُوْنَ : تم لوگ جانتے نہیں
اُوْلٰىهُمْ : ان کی پہلی
فَمَا كَانَ : پس نہیں تھی
عَلَيْنَا : ہم پر
فَذُوْقُوْا : تو چکھو
بِمَا : بسبب اس کے جو

اَيْنَ : کہاں ہے
كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ : تم لوگ پکارا کرتے تھے
قَالُوْا : تو وہ لوگ کہیں گے
عَنَّا : ہم سے
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ : اپنے نفس کے خلاف
كَانُوْا : تھے
قَالَ : وہ (یعنی اللہ) کہے گا
فِيْٓ اُمَمٍ : ایک ایسی امت میں جو
مِنْ قَبْلِكُمْ : تم لوگوں سے پہلے
وَالْاِنْسِ : اور انسانوں میں سے
كُلَّمَا : جب کبھی
اُمَّةٌ : کوئی امت
اُخْتَهَا : اپنی بہن (یعنی دوسری امت) کو
اِذَا : جب
فِيْهَا : اس میں
قَالَتْ : تو کہے گی
لِاُوْلٰىهُمْ : اپنی پہلی کے لیے
هٰٓؤُلَآءِ : یہ ہیں
فَاٰتِهِمْ : پس تو دے ان کو
مِّنَ النَّارِ : آگ سے
لِكُلٍّ : ہر ایک کے لیے
وَّلٰكِنْ : اور لیکن
وَقَالَتْ : اور کہے گی
لِاُخْرٰىهُمْ : اپنی دوسری سے
لَكُمْ : تمہارے لیے
مِنْ فَضْلٍ : کسی قسم کی کوئی فضیلت
الْعَذَابَ : عذاب کو
كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ : تم لوگ کمائی کرتے تھے

نوٹ ۱: آیت ۳۷ میں آیا ہے کہ نافرمان لوگوں کو اَلْکِتٰب میں سے ان کا حصہ پہنچے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیوی زندگی کے لیے ان کی تقدیر میں جو مہلت عمر اور رزق وغیرہ لکھا ہوا ہے وہ ان کو ملے گا اور ان کی نافرمانی کی وجہ سے اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی' کیونکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں ہے۔

نوٹ ۲: دوزخی لوگ اپنے پیش رو لوگوں کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ ان لوگوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا' اس لیے ان کو دوگنا عذاب دے' ایک ان کی اپنی گمراہی کا اور دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ سب کے لیے دوگنا عذاب ہے۔ اس کی وجہ سمجھ لیں جس کی وضاحت مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ نے کی ہے۔

نیکی ہو یا بدی' دونوں اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے کرنے والے کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں' بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہوسکتا ہے اور بدی کا ایک تخم لق و دق جنگل کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے (جو سورۃ النساء' آیت ۸۵ میں اور احادیث میں بیان ہوا ہے) کہ تم میں سے اگلے اور پچھلے دونوں ہی کے لیے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں سے بھی حصہ ملنے والا ہے جن کے لیے تم نے ان گناہوں کی مثال قائم کی۔ تم فریاد کر رہے ہو کہ تمہارے اگلوں نے تمہارے لیے بری مثال قائم کی' اس وجہ سے ان کو زیادہ عذاب ہو۔ ان کو بے شک زیادہ عذاب ملے گا' لیکن تم نے جو بری مثال اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑی' اس کے نتائج سے تم کس طرح بچ جاؤ گے؟ جو پیمانہ ان کے لیے ہے وہی پیمانہ تمہارے لیے ہے۔ اگر ان کی روشِ بد کے ساتھ ساتھ تم اپنی روش بد کے اثرات کا بھی علم رکھتے تو تم مانتے کہ تم اور وہ' دونوں یکساں مجرم ہو۔ لیکن تمہیں اپنے بوئے ہوئے تخم بد کی ہولناکیوں کا علم نہیں ہے۔ اب وہ تمہارے سامنے آئے گا۔ (تدبر قرآن)

یہاں پر کچھ ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے وقت زمین پر جو آخری نسل انسانی بدی میں ملوث ہوگی' ان کی بدی کے اثرات تو کسی اگلی نسل کو منتقل نہیں ہوں گے' تو کیا ان کو اکہرا عذاب ہوگا؟ اس کا جواب نفی میں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لِکُلٍّ (سب کے لیے' ہر ایک کے لیے) فرمایا ہے۔ اس کی وجہ وہ لوگ آسانی سے سمجھ لیں گے جنہوں نے statistics (اَعداد و شمار کا علم) میں extrapolation کا فارمولا پڑھا ہے۔ دوسرے طلبہ اس کو اس طرح سمجھ لیں کہ کسی چیز کے گزشتہ کافی سالوں کے اعداد و شمار موجود ہوں تو ماضی میں ہونے والی کمی یا اضافہ کے رجحان کی بنیاد پر مذکورہ فارمولے کے ذریعے تخمینہ لگا لیتے ہیں کہ چند سال کے بعد اعداد و شمار کیا ہوں گے۔ عام طور پر یہ تخمینے تقریباً صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اگر کبھی تھوڑا بہت یا کبھی کبھار زیادہ فرق ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی علم پرفیکٹ نہیں بلکہ ناقص ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر نقص سے پاک ہے۔ اس لیے اس کا علم بھی پرفیکٹ ہے اور وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اس کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ وہ آخری نسلوں کی بدی کے منتقل ہونے والے اثرات کا بالکل ٹھیک ٹھیک (exact) حساب کر کے ان لوگوں کو اس کی بھی سزا دے۔ اس لیے فرمایا لِکُلٍّ ضِعْفٌ۔

حُجّیتِ حدیث اور انکارِ حدیث: ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ☆

کچھ عرصہ پہلے کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر احادیث پر اعتراضات کی ایک تحریک شروع کی، جس میں ثابت شدہ صحیح احادیث اور آثار کے بارے میں تمسخر اور استہزاء کا رویہ اختیار کیا گیا۔ ان لوگوں میں قاری حنیف ڈار صاحب پیش پیش تھے جو کہ غامدی مکتب فکر سے متاثر ہیں۔ گجرات سے تعلق ہے، لیکن آج کل جامع مسجد پاکستان سینٹر، ابوظہبی میں خطیب ہیں۔ قاری صاحب نے اپنے فیس بک پیج کی وال کو احادیث کے خلاف مواد سے بھر دیا اور علم نہ رکھنے والے سادہ لوح مسلمانوں نے ان سطحی اعتراضات کو خوب خوب شیئر کیا۔ علاوہ ازیں فکر فراہی اور فکر اصلاحی سے متاثر بعض پروفیسر صاحبان بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس طرح احادیثِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بدظنی کی ایک فضا عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ مُلحدین (atheists) جو کہ سوشل میڈیا پر سرگرم تھے، انہوں نے ان اعتراضات کو خوب مرچ مسالہ لگا کر پھیلایا اور عام کیا کہ جس سے عام مذہبی طبقے میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر کئی ایک مخلص علماء اور طلبہ نے احادیث کی حجیت کے حق میں لکھا۔ راقم نے بھی قاری حنیف ڈار صاحب اور دیگر حضرات کے جواب میں کئی ایک تحریریں مرتب کی تھیں۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ ان تحریروں میں بعض اہم نکات آ گئے ہیں، لہٰذا انہیں کہیں شائع ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ سوشل میڈیا کی انہی تحریروں کو کچھ تہذیب اور تنقیح کے بعد ایک مضمون کی شکل میں مرتب کیا ہے تا کہ احادیث پر معاصر اعتراضات کی حقیقت کا تجزیہ کیا جا سکے۔

مختلف عناوین کے تحت یہ جو تحریریں ہیں، کئی نوعیت کی ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے جو تحریریں نقل کی گئی ہیں، وہ اصولی نوعیت کی ہیں کہ جن میں قرآن مجید کی حجیت اور احادیث کی حجیت کے بارے میں اصولی اور نظری بحثیں موجود ہیں۔ اس حصے کی تحریروں میں بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید جس ذریعے سے ثابت ہوتا ہے، اسی ذریعے سے احادیث بھی ثابت ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کی تحریریں کتب احادیث، خاص طور پر صحیح بخاری کی حجیت اور اہمیت کے بارے میں ہیں۔ اس حصے کی تحریروں میں خاص طور پر صحیح بخاری کے بارے میں منکرین احادیث کی غلط فہمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی تحریروں میں بعض احادیث پر منکرینِ احادیث کے عقلی و منطقی اعتراضات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اصولی اور فروعی دونوں صورتوں میں احادیث کی حجیت اور ان کے انکار کے مسئلے کو علمی و عقلی بنیادوں پر پرکھا گیا ہے۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور۔ ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk
فیس بک: www.facebook.com/hm zubair

قرآن مجید کی روایات

ہمارے دین کے دو بنیادی مصادر ہیں: قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اللہ کے رسول ﷺ سے قرآن مجید نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقل قرآن کو اصطلاح میں ''قراءت'' کہتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اللہ کے رسول ﷺ سے سنت نقل کرتے ہیں تو ان کے اس نقلِ سنت کو ''حدیث'' کہتے ہیں۔ پس قراءت' قرآن مجید کی روایت ہے اور حدیث' سنت کی روایت ہے۔

قرآن مجید اور سنت ہمیں اللہ کے رسول ﷺ سے قطعی خبر کے ذریعے سے ملے ہیں۔ قرآن مجید کی وہ روایات جو قطعی طور ثابت ہیں اور جنہیں اُمت میں تلقّی بالقبول حاصل ہے اور ان پر امت کا اجماع ہے تو وہ کُل بیس روایات ہیں کہ جنہیں اصطلاح میں قراءاتِ سبعہ عشرہ بھی کہتے ہیں۔ قراءات کے امام دس ہیں کہ جن کے شاگرد بیس ہیں اور قرآنی روایات انہی شاگردوں کے نام سے منسوب ہیں۔ (۱)

اُمتِ مسلمہ کے پاس اس وقت جو قرآن مجید موجود ہے' وہ انہی قُرّآء کی سند سے موجود ہے۔ اگر ان قراء کو درمیان سے نکال دیا جائے تو امت کے پاس موجود مصحف کو اللہ کے رسول ﷺ کا چھوڑا ہوا مصحف ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں اس وقت قرآن مجید کی چار روایات رائج ہیں کہ جن میں معروف ترین روایت ''روایتِ حفص'' ہے' جبکہ دوسرے نمبر پر ''روایتِ وَرش'' ہے۔ ان کے علاوہ روایتِ قالون' روایتِ دُوری بھی بعض ممالک میں عوامی طور پر پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کی ''روایتِ دُوری'' سوڈان' صومالیہ' نائیجیریا' چاڈ اور وسطی افریقہ میں عوامی سطح پر پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی ''روایتِ قالون'' لیبیا اور تیونس میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی ''روایتِ ورَش'' الجزائر' موریطانیہ' مراکش' مالی' سینیگال وغیرہ میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور مسلم دنیا کے اکثر حصے میں ''روایتِ حفص'' پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہی روایت ہمارے ہاں جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں رائج ہے۔ (۲)

دنیائے اسلام کے مشرق میں اگر مصحف' روایتِ حفص میں شائع ہوتے ہیں تو بلادِ مغرب اور افریقہ میں مصاحف کی اشاعت روایت ورش' قالون اور دُوری میں ہوتی ہے۔ اور بلادِ مغرب میں لاکھوں قراء کرام اور کروڑوں عوام الناس اپنی نمازوں اور نمازوں کے علاوہ میں بھی تلاوت اپنی روایت کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ سب روایات قطعی طور اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔

حال ہی میں شاہ فہد پرنٹنگ پریس' مدینہ منورہ' سعودی عرب نے بلادِ مغرب اور افریقہ کے مسلمانوں کے لیے ان کی روایات میں قرآن مجید طبع کیے ہیں' جن میں سے ایک معروف روایت ''روایت ورَش عن نافع'' ہے۔ یہ مصحف اسی طرح سے طبع کیا گیا ہے جیسا کہ بلادِ مغرب میں موجود مسلمان حکومتوں کی وزارتِ اوقاف انہیں اپنے عوام کے لیے شائع کرتی ہے۔ بلادِ مغرب کے ان شائع شدہ مصاحف میں ہمارے ہاں کے شائع شدہ مصاحف سے کچھ رسم' کچھ قراءات اور کچھ ضبط کے اختلافات ہیں' اور یہ تینوں مختلف علوم ہیں کہ جنہیں علومِ

قرآنیہ کے طلبہ ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلادِ مغرب میں جو مصاحف شائع ہوتے ہیں' ان میں بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت شمار کیا گیا ہے اور انہیں سورت میں شامل کر کے لکھا گیا ہے۔ (۳) جبکہ ہمارے ہاں شائع شدہ مصاحف میں بسم اللہ کو سورت سے علیحدہ لکھا جاتا ہے اور اسے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی مستقل آیت شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ قراءت کا اختلاف ہے۔ اسی طرح بلادِ مغرب کے مصاحف میں قاف کو لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے اوپر ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں قاف کے اوپر دو نقطے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بلادِ مغرب کے مصاحف میں فاء کو لکھتے وقت اس کے نیچے ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں فاء کو لکھتے وقت اس کے اوپر ایک نقطہ ہوتا ہے۔ یہ علم الضبط کی مثال ہے۔ (۴)

قرآن مجید کی حفاظت کا اصل ذریعہ کتابت یا حفظ؟

ہر دور میں کسی شے کو محفوظ کرنے کے ذرائع مختلف رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں عربوں میں علم کو محفوظ کرنے کا اصل ذریعہ حفظ تھا' جیسا کہ دورِ جاہلیت کی عرب شاعری کو زبانی ہی محفوظ کیا گیا ہے اور زبانی ہی نقل کیا گیا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں کتابت کو اہمیت حاصل ہوتی چلی گئی اور آج جدید دور میں' جسے ہم آئی ٹی کا دور کہتے ہیں' کتابت بھی متروک ہو چکی ہے اور اس کی جگہ کمپیوٹرائزیشن لے چکی ہے۔

اب ہم اپنا علم اپنی ڈائری کی بجائے اپنی ہارڈ ڈسک میں محفوظ رکھتے ہیں اور اب تو کتابیں کیا' لائبریری تک ہارڈ ڈسک میں موجود ہوتی ہے۔ علومِ اسلامیہ کے طلبہ کے لیے اس کی بہترین مثال ''المکتبۃ الشاملۃ'' ہے' جس میں کوئی ساٹھ ہزار تک کتب جمع کی جا چکی ہیں۔ اب طلبہ کتاب کی ہارڈ کاپی کی بجائے سوفٹ کاپی سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے کے علم کو محفوظ کرنے اور رکھنے کا ایک مزاج ہوتا ہے اور زمانہ قدیم میں یہ مزاج حفظ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوئی تو سینکڑوں حُفّاظ موجود تھے' لیکن قرآن مجید کا ایک بھی لکھا ہوا مکمل نسخہ موجود نہ تھا' حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آ کر سب سے پہلے قرآن مجید کا پہلا مکمل نسخہ تیار کروایا جو کہ ایک سرکاری نسخہ تھا۔ آپ ﷺ کے زمانے میں قرآن مجید جو کہ لکھا گیا تھا' وہ ایک جگہ جمع نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی قرآن مجید کا ایک سرکاری نسخہ تو تیار ہو گیا لیکن اس کی کتابی اشاعت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بھی گزر گیا اور قرآن مجید کا ایک ہی سرکاری نسخہ موجود رہا۔ پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک سے زائد نسخے تیار ہوئے اور وہ بھی پانچ سے زائد نہ تھے (۵)۔ گویا خلافت راشدہ میں قرآن مجید کے عوامی سطح پر پڑھنے پڑھانے کا جو عمل جاری تھا' وہ استاذ اور شاگرد کے باہمی تعلق سے جاری تھا اور قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کا جو ذریعہ استعمال ہوا' وہ حفظ تھا۔ اسی لیے تو اللہ عزوجل نے قرآن مجید کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ اہل علم کے سینوں میں وہ آیات ہیں' جو واضح ہیں۔ (۶)

پس قرآن مجید وہی ہے جو اہل علم کے سینے میں محفوظ ہوا اور پھر سینہ بہ سینہ نقل ہوا ہے۔ قُرّاء کرام نے قرآن مجید کی اسناد اور روایات کو محفوظ کیا اور آج ہر قاریٔ قرآن کے پاس ایسی سند موجود ہے کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچنے والی ہے۔ آج بھی جبکہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ اپنے عروج پر ہے اور مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں' قرآن مجید میں اصل اعتبار حفظ کا کیا جاتا ہے نہ کہ کتابت کا۔

دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں حکومت کی اجازت سے جو مصاحف شائع ہوتے ہیں' ان کی تصدیق پہلے قراء کرام سے کروائی جاتی ہے۔ پاکستان کی وزارت مذہبی امور اس وقت تک کسی پبلشر کو مصحف شائع کرنے کی اجازت فراہم نہیں کرتی جب تک کہ دو قراء کرام اس مصحف کی صحت کی تصدیق نہ کر دیں۔ لہٰذا قرآن مجید کی نقل میں اصل قراء ہیں نہ کہ مصاحف' کہ لکھے ہوئے کی تصدیق قُرّاء اور حُفّاظ کر رہے ہیں۔ لکھا ہوا قرآن مجید یا مصحف اس وقت تک مستند نہیں ہے جب تک کہ اسے قُرّاء اور حُفّاظ کی مہرِ تصدیق حاصل نہ ہو جائے۔

اور اہم تر بات یہ ہے کہ لکھے ہوئے کو پڑھنا اور صحیح پڑھنا کسی بھی زبان میں بغیر ماہر استاذ کے ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی زبان میں تلفظ اور لہجات (accents and dialects) کا فرق ہوتا ہے۔ کسی زبان میں کچھ حروف ساکت (silent) ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان کا ایک ہی لفظ امریکن کسی اور طرح ادا کرتے ہیں اور برطانوی کسی اور طرح سے۔ اور بعض اوقات تو زمین و آسمان کا فرق ڈال دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید اگر لکھا ہوا بھی ہے تو اس لکھے ہوئے کو کیسے پڑھنا ہے؟ تو اس میں پھر اصل قراء اور حفاظ ہیں۔ اگر آپ لکھے ہوئے کو ویسے ہی پڑھیں جیسا کہ وہ لکھا ہوا ہے تو قرآن مجید کے بہت سے مقامات کو غلط پڑھ جائیں گے۔ ان باتوں کی گہرائی سے قراء خوب واقف ہیں کہ بعض مقامات پر قراءت' ظاہری رسم کے مطابق نہیں ہو رہی ہوتی ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں اصل نقل ہے نہ کہ کتابت' اور نقل بھی ماہرین کی نہ کہ عوام کی۔ قراء اور عوام کے قرآن مجید محفوظ رکھنے میں جو فرق ہے' وہ سب کے علم میں ہے۔ دیہات میں بوڑھی اماں جی بھی بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہی ہوں گی اور ان کے بھی سینکڑوں شاگرد ہوں گے اور ان کے اخلاص کا اللہ کے ہاں انہیں اجر بھی ملے گا' لیکن کیا ان بوڑھی اماں نے قرآن مجید کو اسی طرح سے محفوظ رکھا ہوا ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز میں تلاوت فرماتے تھے؟ تو یہ اعزاز صرف قراء کو حاصل ہے۔

کتاب وسنت کا باہمی تعلق

عرصہ ہوا جناب مفتی فیصل جاپان والا کے توسط سے کراچی میں غامدی صاحب کے شاگرد مُعز امجد صاحب سے ایک علمی گفتگو ہوئی تھی کہ جس میں راقم کے ساتھ جناب طاہر اسلام عسکری صاحب بھی شریک تھے۔ اس مجلس کا کُل حاصل میرے لیے ایک جملے میں یہ تھا کہ معز امجد صاحب نے یہ کہا کہ میرے لیے بنیادی ترین سوال یہ ہے کہ کتاب وسنت کا باہمی تعلق کیا ہے؟

یہ امر واقعہ ہے کہ ان سے ملاقات سے پہلے میں نے اس سوال پر غور نہیں کیا تھا لیکن اس نشست کے بعد واقعتاً یہ محسوس ہوا کہ دین کے ایک سنجیدہ طالب علم کے لیے یہ بہت ہی بنیادی سوال ہے۔ اس سوال پر مطالعہ اور

غور وفکر شروع کیا اور پھر اس موضوع پر کافی کچھ لکھا بھی کہ جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کر رہا ہوں۔

سلف صالحین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ سنت' کتاب کے علاوہ کوئی دین کا مصدر ہے یا یہ دونوں ایک ہی مصدر ہیں؟ یہ بہت باریک نکتہ ہے کہ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ کتاب ایک علیحدہ مصدرِ دین ہے اور سنت ایک علیحدہ مصدرِ دین ہے' جبکہ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ نہیں' کتاب وسنت ایک ہی مصدر ہے' یہ دو مصادر نہیں ہیں۔ (۷) اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں بہت سی ایسی احادیث کہ جنہیں علماء کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے' انہیں کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جمہور کے نزدیک سنت' کتاب اللہ کے احکامات کی شرح اور بیان بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی ہے کہ سنت میں بعض احکامات ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ سنت کُل کی کُل' قرآن مجید کا بیان ہے۔ یعنی سنت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو کتاب اللہ کی کسی آیت کی شرح اور بیان نہ ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی بہت سی احادیث کو جنہیں لوگ کتاب اللہ پر اضافہ سمجھتے تھے' کتاب اللہ کا بیان ثابت کیا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ اگرچہ موقف دونوں درست ہیں کہ اصولی طور پر اللہ کے رسول ﷺ ہی دین کا مصدر ہیں' چاہے کتاب اللہ ہو یا سنتِ رسولؐ' دونوں آپؐ کی ذات ہی سے صادر ہوتے ہیں' لہٰذا آپ ﷺ کی سنت کو کتاب اللہ سے علیحدہ مصدر ماننے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں' لیکن عملی بات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی زیادہ صحیح ہے کہ سنت' کتاب اللہ کا بیان ہے اور یہ دونوں مل کر ایک ہی مصدر ہیں۔

سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول' فعل اور تقریر ہے جو حدیث میں موجود ہے۔ اس مجلس کے بعد سے راقم کے سامنے جب بھی کوئی اہم سنت آتی ہے تو فوراً ذہن قرآن مجید کی کسی آیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ سنت اس آیت کا بیان ہے۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی احادیث کے ذریعے کتاب اللہ کو کھول کر بیان کیا ہے اور ہر حدیث' کسی نہ کسی آیت ہی کا بیان ہے۔ پس قرآن مجید الفاظ ہیں اور سنت ان الفاظ کا معنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ اہم ہے اور سنت میں معنی۔ قرآن مجید میں لفظ کی حفاظت پر زور ہے اور سنت میں معنی کی۔ لفظ اور معنی کا تعلق لازم وملزوم کا ہے۔ جو لوگ سنت کا انکار کرتے ہیں' وہ صرف اللہ کے الفاظ کو قبول کرتے ہیں اور ان الفاظ سے اللہ کی مراد کو نکال کر اپنی مراد ڈال دیتے ہیں۔

قادیانیت' رافضیت' باطنیت' خوارجیت' اعتزال وغیرہ جیسی جتنی فکری گمراہیاں ہیں' سب کی بنیاد قرآن مجید ہے۔ اور قرآن مجید اسی وقت گمراہی کی بنیاد بن جاتا ہے جب اس کے الوہی معنی یعنی سنت کا انکار کر دیا جائے۔ اور پھر تو صرف الفاظ ہیں' اب آپ ان سے جو کھیل کھیلنا چاہیں' کھیل سکتے ہیں۔ اور اسی لیے خود قرآن مجید نے کہا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ (۸)

''اس (قرآن مجید) کے ذریعے اللہ عزوجل بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اسی سے ہدایت دیتا ہے۔''

سنت اور حدیث میں فرق

ایک دوست نے پوچھا کہ کیا سنت اور حدیث میں فرق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ ماخذِ دین سنت ہے یا حدیث؟ تو اس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب میں موجود ہے۔ اصل سوال پہلا ہے اور پہلے سوال کا جواب صحیح تصورِ دین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سلف صالحین کی اصطلاح میں سنت' اللہ کے رسول ﷺ کے قول' فعل اور تقریر کو کہتے ہیں (۹) اور حدیث' اس سنت کی روایت کا نام ہے۔ پس سنت پہلے ہے اور حدیث بعد میں ہے۔ سنت آپ ﷺ کا قول' فعل اور تقریر ہے اور حدیث اس قول' فعل اور تقریر کے بیان کا نام ہے کہ جو صحابی کا ہوتا ہے (۱۰)۔ اس لیے صحیح اور ضعیف حدیث ہوتی ہے نہ کہ سنت' کیونکہ سنت تو اللہ کے رسول ﷺ کا قول' فعل اور تقریر ہے' تو وہ کیسے ضعیف یا موضوع ہوسکتا ہے؟ البتہ وہ حدیث ضعیف یا موضوع ہوسکتی ہے کہ جس میں سنت منقول ہو۔ سنت اور حدیث کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے بہت سے لوگ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔

پس سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب آپ اہمیت کی بات کریں گے تو اصل اہمیت مظروف اور مکین کی ہے نہ کہ ظرف اور مکان کی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ بعض اوقات مظروف اپنے ظرف سے پہچانا جاتا ہے اور مکین کا تشخّص اس کا مکان بن جاتا ہے' لہٰذا دونوں کی اہمیت مسلّم ہے۔

چنانچہ جہاں تک دوسرے سوال کا جواب ہے تو وہ یہی ہے کہ سلف صالحین کے نزدیک مصادرِ شریعت کتاب وسنت ہی ہیں نہ کہ کتاب وحدیث' جیسا کہ جمیع مذاہب کی کتب اصول میں مصادرِ دین کی بحث کے تحت کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول ﷺ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہمیشہ سے کتاب وسنت کی اصطلاح ہی مستعمل رہی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا قول' فعل اور تقریر ہے۔ کتاب تو ''مَا بَيْنَ الدُّفَّتَيْن'' موجود ہے اور سنت کہاں ہے؟ یہ اہم سوال ہے کہ جس سے حدیث کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ سنت کا صرف اور صرف ایک ہی مصدر ہے اور وہ احادیث کی کتب ہیں۔

ہمارے ہاں سنت اور حدیث میں فرق کے حوالہ سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں' بلکہ جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہیں' اور یہ دونوں غلط فہمیاں امین احسن اصلاحی صاحبؒ نے پیدا کی ہیں' اور اس کا سبب یہ بنا کہ حدیث ان کا میدان نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا عطاء اللہ حنیفؒ کو یہ خبر پہنچی کہ امین احسن اصلاحیؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ''تدبر قرآن'' کے بعد ''تدبر حدیث'' لکھ کر حدیث کی بھی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو مولانا نے کہا کہ اللہ ان سے یہ خدمت نہ ہی لے تو بہتر ہے۔ اور وجہ یہی تھی کہ حدیث امین احسن اصلاحیؒ کا میدان نہ تھا۔

امین احسن اصلاحی صاحبؒ نے سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کا عمل لیا اور آپ ﷺ کا قول اور تقریر اس سے نکال دیا' (۱۱) حالانکہ اصولِ فقہ کی تمام کتابوں میں جمیع مکاتبِ فکر کے اصولیین کے نزدیک سنت کی

تعریف میں فعل کے ساتھ آپ ﷺ کا قول اور تقریر بھی شامل کیا گیا ہے۔

دوسری غلط فہمی جو امین احسن اصلاحی صاحبؒ نے پیدا کی' وہ یہ ہے کہ سنت کا مصدر احادیث کی کتابیں نہیں ہیں۔ پھر سنت ہمیں کہاں ملے گی؟ اس کا جواب اصلاحی صاحب کے ہاں یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں' بلکہ اس کا جواب ان کے ہاں یہ ہے کہ سنت ہمیں ''تواتر عملی'' میں ملے گی۔ حالانکہ اس امت میں بشمول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کسی مذہب کے بانی کا یہ موقف نہیں رہا ہے کہ سنت ہمیں تواتر عملی میں ملے گی' بلکہ سب نے اخبارِ آحاد ہی کو سنت کا ماخذ مانا اور قرار دیا ہے۔ اصلاحی صاحب کے اس تصورِ سنت کو جناب غامدی صاحب نے ایک جامع فکر کی صورت میں نہ صرف پیش فرمایا بلکہ اس کی تشہیر بھی فرمائی۔ (۱۲)

پس سنت اور حدیث میں فرق معمولی ہے اور یہ فرق ایسا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں کہ سنت مکین ہے اور حدیث اس کا مکان ہے' سنت مظروف ہے اور حدیث اس کا ظرف ہے۔ یہ سلف کی اصطلاح میں ہے کہ جب وہ سنت کو بطور مصدر شریعت بیان کرتے ہیں تو اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ پس حدیث' سنت کا ماخذ اور مصدر ہے اور سنت دین کا ماخذ اور مصدر ہے۔

تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟

مکتب اصلاحی' فکر غامدی اور ان کے متاثرین کا کہنا ہے کہ دین' سنت میں ہے اور سنت' تواتر عملی میں ہے۔ لیکن سوال یہاں ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ تواتر عملی کی سند کہاں ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف لفظ استعمال کرنا جانتے ہیں لیکن اس لفظ پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ کیا استعمال کر رہے ہیں؟

تواتر عملی سے مراد وہ عمل ہے جو مسلم معاشرے میں نسل در نسل اور پے در پے ہو رہا ہو۔ آج مسلم معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے' چاہے وہ پے در پے ہی کیوں نہ ہو' وہ مستند نہیں ہے' کیونکہ اکثر بدعات اور معاصی پے در پے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ بدعات اور معاصی کو بدعت اور معصیت کا عنوان دینا بھی چاہیں گے تو خبر کی بنیاد پر ہی دیں گے۔ لہٰذا کسی معاصر معاشرتی عمل کو سنت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سند کو اللہ کے رسول ﷺ کے قدموں تک پہنچایا جائے۔ پس کسی عمل کو متواتر عملی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل کو اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلسل ہر زمانے میں ثابت کیا جائے۔ آپ ﷺ سے لے کر آج تک تقریباً بتیس نسلیں اور چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ پس ایک عمل' تواتر عملی سے ثابت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اُمت مسلمہ کی تاریخ میں چودہ صدیوں میں ہر صدی میں رائج رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ چودہ صدیوں میں ایک عمل ہر صدی میں امت مسلمہ میں رائج رہا ہے اور میں اور آپ اس وقت چودھویں صدی میں ہیں تو ہمارے پاس پہلی تیرہ صدیوں میں جھانک کر دیکھنے کا کیا ذریعہ ہے کہ یہ عمل ان صدیوں میں بھی امت مسلمہ میں رائج تھا یا نہیں؟ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ جو چودھویں صدی میں امت میں رائج ہے' وہ سب پہلی صدی ہی سے چلا آ رہا ہے؟ تو اس سے بڑی بے وقوفی کی کوئی بات نہ ہوگی۔

ماضی کے معاشروں کا تواتر عملی جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے' اور وہ ہے خبر کا ذریعہ۔ اب اسے تاریخ

کہہ لیں یا روایت' اس سے آپ کی جان نہیں چھوٹنے والی۔ ماضی میں کسی عمل کا تواتر علمی سے ثابت ہونا بغیر خبر کے ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا جو حدیث کی خبر سے بھاگے ہیں' ان کے گلے تاریخ پڑ گئی ہے۔ اور اب تواتر عملی' تاریخ سے ثابت کرنے چلے ہیں۔ تو خبر اصل ہوئی یا تواتر عملی؟

کیا اللہ کا دین صحیح اور ضعیف ہوسکتا ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو اکثر منکرین حدیث کی زبانوں پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ کا دین ہے تو اس میں صحیح اور ضعیف کا اختلاف کیوں ہے؟ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ حدیث کی طرح قرآن مجید میں بھی متواتر اور شاذ کا اختلاف موجود ہے۔ اگر آپ کے علم میں نہیں ہے تو حسن بصری (متوفیٰ ۱۱۰ھ)' ابن محیصن (متوفیٰ ۱۲۳ھ)' اعمش اسدی (متوفیٰ ۱۴۸ھ) اور یحییٰ یزیدی (متوفیٰ ۲۰۲ھ) کی مروی قراءات دیکھ لیں (۱۳)۔ یہ چاروں حضرات تو اتنے معروف ہیں کہ ان کی شاذ قراءات کے مصاحف بھی طبع ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح شاذ قراءات کے وجود سے قرآن مجید مشتبہ نہیں قرار پاتا' اسی طرح موضوع روایات کے موجود ہونے سے مقبول احادیث پر طعن وارد نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ احادیث کا ایک بڑا اور غالب ذخیرہ ایسا ہے کہ جس کی صحت وضعف میں اختلاف نہیں ہے اور کم احادیث ہیں کہ جن کی صحت وضعف کی بابت ائمہ سلف کا اختلاف ہوا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جن احادیث کی صحت وضعف میں ائمہ سلف کا اختلاف نقل ہوا ہے' وہ احادیث اصول ومبادیٔ دین سے متعلق نہیں ہیں بلکہ جزئیات اور فروعات سے بحث کرتی ہیں' لہٰذا دین کے اصول ومبادی کل کے کل مقبول روایات سے ہی ثابت ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ہم بار بار یہ واضح کر رہے ہیں کہ اللہ کا دین حدیث ہے' یہ عوامی بیان ہے' جبکہ علمی بیان یہ ہے کہ اللہ کا دین حدیث میں موجود ہے' یعنی اللہ کا دین سنت ہے جو حدیث میں موجود ہے' لہٰذا حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا مطلب دین کی صحت اور ضعف نہیں ہے بلکہ دین کی اپنے شارع کی طرف نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا ہے۔ اور نسبت کا صحیح یا ضعیف ہونا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ کسی حدیث کی صحت وضعف میں اختلاف مخاطبین کی جہت سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جہت سے۔ پس اگر قرآن مجید میں موجود اللہ کے دین اور حکم تک بذریعہ فہم پہنچنے میں مجتہدین اور فقہاء کا اختلاف ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ شریعتیں دو ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا حکم ایک ہی ہے لیکن بعض فقہاء نے اس کو پا لیا اور بعض نہ پا سکے۔ اور اجر وثواب دونوں کے لیے ہے' اگرچہ جس نے حکم پا لیا اس کے لیے دوگنا اجر اور جس نے نہ پایا تو اس کے لیے ایک گنا اجر ہے۔ پس جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو بذریعہ استدلال واستنباط پا لینے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں' اسی طرح احادیث میں موجود اللہ کے حکم کے اثبات ونفی میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

آخری اور چھٹی بات یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا دین کتاب اللہ اور احادیث رسول ﷺ میں محفوظ

ہے تو یہ من جملہ حفاظت کی بات ہوتی ہے۔ یعنی اُمت کے پاس وہ احادیث موجود ہیں کہ جن میں اللہ کا حکم ہے' لہٰذا کسی محدث نے اپنی تحقیق سے اس حکم کو پالیا اور کوئی نہ پاسکا' جس طرح اللہ کی کتاب میں موجود حکم کو کسی مجتہد نے پالیا اور کوئی اس کو نہ پاسکا۔ چنانچہ جس مجتہد نے اللہ کا حکم نہ پایا تو اس نے جو پایا ہے' وہ اللہ کا حکم نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے ایک گنا اجر ہے۔ یہ گہری بات ہے اور یہی قاعدہ محدثین کے لیے بھی جاری ہوتا ہے۔

عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ میں احادیث کی کتابت

آغازِ اسلام میں اللہ کے رسول ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا کہ اس میں کئی حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ لوگ ابھی تک قرآن مجید کے اسلوبِ کلام سے مانوس نہ تھے' لہٰذا وہ قرآن مجید کے ساتھ حدیث کو خلط ملط کر دیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ شروع اسلام میں قرآن مجید میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا' وہ عقائد' سابقہ اقوام کے قصص اور اخلاقیات تھیں کہ جن کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ مکی سورتوں کے مضامین عموماً یہی ہیں۔ لہٰذا مکہ کے ابتدائی تیرہ سال میں احادیث کی ضرورت نہ تھی' صرف قرآن مجید ہی کافی تھا۔ شریعت مدنی سورتوں میں مدینہ میں جا کر نازل ہوئی کہ جس کی تفصیل اور وضاحت اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی احادیث سے بیان فرمائی۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق شروع اسلام میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھو اور جس نے قرآن مجید کے علاوہ لکھا ہے' تو وہ مٹا دے (۱۴)۔ اس کے بعد جبکہ مسلمان قرآن مجید کے اسلوبِ کلام سے مانوس ہو گئے اور شرعی احکام کا نزول شروع ہو گیا تو آپ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میں آپؐ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں' کیا انہیں لکھ لیا کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! لکھ لیا کرو''۔ انہوں نے کہا کہ آپؐ کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی غصے میں ہوتے ہیں (تو کیا ہر حال میں کہی ہوئی بات لکھ لیا کروں)؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! اللہ کی قسم! میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ جاری نہیں ہوتا (چاہے میں کسی حال میں بھی ہوں)''۔ (۱۵)

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ جو باتیں انہوں نے فتح مکہ کے خطبۂ عام میں آپ ﷺ سے سنی ہیں' وہ انہیں لکھ کر دے دی جائیں۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ ابوشاہ کو میرے خطبہ کی باتیں لکھ کر دے دو! اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں کہ جن میں نبی ﷺ کے زمانے میں ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احادیث لکھنے کا بیان ہے (۱۶)۔ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے زیادہ کوئی بھی حدیث نبویؐ کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں تھا' کیونکہ وہ آپ ﷺ کی احادیث لکھ بھی لیتے تھے اور یاد بھی کرتے تھے جبکہ میں صرف یاد رکھتا تھا اور لکھتا نہ تھا۔ (۱۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابوجُحیفہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی کا علم ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس قرآن مجید کا فہم ہے اور یہ ایک صحیفہ ہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ اس صحیفے میں کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ دیت' قیدیوں کو چھوڑنے اور کافر کے بدلے مسلمان کو قتل

نہ کرنے جیسے احکامات ہیں (۱۸)۔ پس تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آپ ﷺ کے زمانے میں ہی احادیث کو لکھا کرتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اللہ کے رسول ﷺ سے جو احادیث لکھی ہیں اُسے "**الصحیفة الصادقة**" کہتے ہیں۔ یہ حدیث کی پہلی کتاب تھی جو آپ ﷺ کے زمانہ میں ہی مدون ہوئی اور محدثین میں نہ صرف اس کا تذکرہ عام ہے بلکہ بہت سے محدثین اپنی کتابوں میں اس سے روایات بھی لائے ہیں۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنی تھیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ اہم ہے کہ جو ان احادیث پر مشتمل ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنی تھیں۔ اسی طرح ہمام بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو احادیث سنی تھیں، انہیں ایک صحیفہ میں جمع کر دیا جو کہ "**صحيفة همام بن مُنبه**" کہلاتا ہے۔ یہ کل ۱۳۸ احادیث ہیں، اور اس صحیفے سے امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر محدثین نے احادیث لی ہیں (۱۹)۔ اس صحیفے کے دو قلمی نسخے، دمشق اور برلن، میں موجود ہیں کہ جن میں فرق نہیں ہے۔ معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ مارکیٹ میں عام دستیاب ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا حُجیّتِ احادیث اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں موقف

حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاں دین کے مصادر کی جو تعداد اور ترتیب بیان کی ہے، وہ قرآن، حدیث اور قولِ صحابیؓ ہے۔ ذیل میں حدیث کے حجت ہونے اور مصدر دین ہونے کے بارے میں علامہ صیمریؒ (متوفی ۴۳۶ھ) اپنی سند سے امام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کر رہے ہیں:

اَخبرَنَا أَبُو الْقَاسِم عبد الله بن مُحمَّد الْبَزّاز قَالَ : ثَنَا مكرم قَالَ : ثَنَا أَحمد بن عَطِيَّة قَالَ : ثَنَا ابْن سَمَّاعَة عَن أبي يُوسُف قَالَ : سَمِعت أَبَا حنيفَة يَقُول : إِذا جَاءَ الحَدِيثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ عَن الثِّقَات أَخذنَا بِهِ، فَإِذا جَاءَ عَن أَصْحَابه لم نخرج عَن أقاويلهم، فَإِذا جَاءَ عَن التَّابِعين زاحمتهم (۲۰)

"امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب ثقہ راویوں سے اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی حدیث ہم تک پہنچ جائے تو ہم اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور اگر آپ ﷺ کے صحابہؓ سے کوئی بات ہم تک پہنچ جائے تو ہم صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلتے۔ اور جب تابعینؒ کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف کرتے ہیں۔"

اسی طرح امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، نعیم بن حماد کی سند سے حدیث کی حجیت کے بارے میں امام صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قَالَ نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ: ثنا ابْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ :سَمِعْت أَبَا حَنِيفَةَ يَقُولُ: إذَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَعَلَى الرَّأْسِ وَالْعَيْنِ، وَإِذَا جَاءَ عَنِ الصَّحَابَةِ نَخْتَارُ مِنْ قَوْلِهِمْ، وَإِذَا جَاءَ عَنِ التَّابِعِينَ زَاحَمْنَاهُمْ (۲۱)

''عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب کوئی بات اللہ کے رسول رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہمارے پاس آ جائے تو وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اور جب صحابہؓ سے کوئی بات آئے تو ہم صحابہ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو اختیار کر لیتے ہیں' اور جب تابعینؒ کی بات آتی ہے تو ہم ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔''

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح حدیث مطلقاً حجت ہے' بلکہ وہ تو اس قدر روایت پسند ہیں کہ حدیث تو کجا صحابہؓ کے اقوال کی موجودگی میں بھی اپنے اجتہاد کا اظہار کرنا درست نہیں سمجھتے ہیں۔ اور پھر جس دین کی یہ شان ہو کہ اس کے جلیل القدر ائمہ کے اقوال کی اسناد تک محفوظ ہوں' تو عجب نہیں ہے کہ کچھ لوگ اس دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہوں۔

اور امام صاحب کے نزدیک صحیح حدیث وہی ہے جو کہ ثقہ راویوں سے مروی ہو' جیسا کہ محدثین کے ہاں بھی حدیث کی صحت کا یہی معیار مقرر ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے فقہاء اور محدثین کے منہج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہاء سے ہماری مراد متاخرین نہیں بلکہ بانیانِ مذاہب ہیں۔

خبرِ واحد اور خبرِ متواتر میں امتیاز کی نوعیت

قرآن مجید اور احادیث دونوں اللہ کا دین ہے۔ اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے نہ کہ صرف قرآن مجید کی حفاظت کا۔ یہ دین ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی خبر کے ذریعے ملا ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی خبر قطعی ہے' اسی طرح احادیث کی خبر بھی قطعی ہے' کیونکہ قرآن مجید اور احادیث ایک ہی ذریعہ سے اس امت کو منتقل ہوئے ہیں اور وہ ذریعہ ''خبر قطعی'' کا ہے۔ اور جس طرح فتنہ پروروں نے احادیث وضع کی ہیں' اسی طرح قرآن مجید بھی گھڑا گیا۔ جس طرح احادیث کی خبر میں ''موضوع'' اور ''صحیح'' کی مصطلحات موجود ہیں' اسی طرح قرآن مجید میں بھی ''شاذ'' اور ''متواتر'' کی اصطلاحات موجود ہیں(۲۲)۔ جس طرح محدثین نے احادیث میں ''صحیح'' کو ''موضوع'' سے جدا کیا' اسی طرح قراء کرام نے ''متواتر'' کو ''شاذ'' سے ممیّز کیا۔

جس طرح احادیث میں طبقات المحدثین ہیں' اسی طرح قرآن مجید میں طبقات القراء ہیں(۲۳)۔ جس طرح احادیث کی خبر کی صحت کی شرائط منقول ہیں جو کہ عام طور محدثین کے نزدیک پانچ ہیں' اسی طرح قرآن مجید کی خبر کی صحت کی بھی شرائط منقول ہیں جو عام طور قراء کے نزدیک تین ہیں کہ جن کا ذکر ہم ایک مستقل مقالہ میں کر چکے ہیں' جبکہ تفصیل کے لیے علامہ ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی ''**منجد المقرئین ومرشد الطالبین**'' دیکھی جا سکتی ہے(۲۴)۔ جس طرح حدیث کی صحت کے اصول' اصولِ حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں' اسی طرح قرآن مجید کی صحت کے اصول' علومِ قرآن کی کتب میں مذکور ہیں۔ پس جس طرح حدیث سند سے نقل ہوئی ہے' اسی طرح قرآن مجید بھی سند سے نقل ہوا ہے۔

اس موضوع پر کچھ دوستوں سے ہمارا ایک مکالمہ ہوا تھا کہ خبر واحد سے ثابت شدہ دین قطعی ہوتا ہے یا ظنی(۲۵)۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ خبر واحد سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے کہ یہی سلف صالحین کا موقف ہے۔

سر دست اس مکالمے کے چند نکات یہاں رکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خبر واحد' حدیث کے مترادف ہے اور حدیث کو خبر متواتر اور خبر واحد میں تقسیم کرنا بے کار کی تقسیم ہے۔ متواتر کی اصطلاح سے قطع نظر عملی صورت حال یہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں صرف ایک حدیث ایسی ہے کہ جسے محدثین نے متواتر مانا ہے' بقیہ سب اخبار آحاد ہی ہیں' لہٰذا ایک حدیث کے لیے اصطلاح وضع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح متواتر کی اصطلاح سلف صالحین کی نہیں ہے' نہ ہی ائمہ اربعہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ یہ یونانی اصطلاح ہے جو منطق کے راستے اصولِ فقہ میں داخل ہوئی۔ ہمارے سلف اس اصطلاح سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ نے اصولِ حدیث کی معروف کتاب ''معرفة أنواع علوم الحديث'' جو کہ ''مقدمہ ابن الصلاح'' کے نام سے بھی معروف ہے' میں لکھا ہے کہ متواتر محدثین کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ منطق کے راستے اصول فقہ میں آئی ہے اور وہاں سے خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اصولِ حدیث میں داخل کیا ہے۔ (۲۶)

دیکھیں! خبر کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کرنے میں ہمیں اعتراض نہیں کہ ''لا مشاحة فی الاصطلاح'' یعنی اصطلاح بنانے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اس تقسیم کا مقصود یہ ہے کہ متواتر سے قطعی دین ثابت ہوتا ہے اور آحاد سے ظنی' تو پھر ہم یہی کہیں گے کہ یہ تقسیم سلف سے دکھائیں' کیونکہ اب آپ اس تقسیم کے ذریعے دین کو تقسیم کر رہے ہیں۔ آپ کی حدیث کا کل ذخیرہ ہے ہی خبر واحد۔ متواتر تو ایک اصطلاح ہے' بس! کہ جس کا اطلاق ڈھونڈے کو نہیں ملتا۔ محدثین کو صرف ایک روایت ملی ہے کہ جسے متواتر کہہ سکیں۔ ایک روایت کے لیے اصطلاح بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے خبر واحد برابر ہے حدیث کے' یہ کہنا ٹھیک ہے' کیونکہ کل ذخیرۂ احادیث ہے ہی خبر واحد۔ خبر واحد اور متواتر میں حدیث کی تقسیم کے راستے دراصل حدیث سے ثابت شدہ دین کو ظنی قرار دیا جاتا ہے اور یہ رویہ ہماری نظر میں خطرناک ہے۔

تواتر' تواتر' تواتر' ایک رانگ نمبر ہے' جس پر ابھی تک کسی کی کال نہیں ملی۔ اگر کسی کی کال ملی ہو تو صرف اتنا بتلا دے کہ کتنے ہوں تو تواتر حاصل ہوتا ہے؟ بس جس دن یہ بتلا دیا گیا کہ اتنوں سے تواتر حاصل ہوتا ہے' اس دن کال مل گئی۔ کچھ نے کہا کہ تواتر چار سے حاصل ہوتا ہے' کچھ نے پانچ' کچھ نے سات' کچھ نے دس' کچھ نے بارہ' کچھ نے چالیس' کچھ نے ستر اور کچھ نے تین سو تیرہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا موقف یہ ہے کہ متواتر وہ ہے کہ جس سے علم قطعی حاصل ہو اور اس میں تعداد کا کوئی عمل دخل نہیں ہے کہ بعض اوقات خبر واحد سے بھی علم قطعی حاصل ہو جاتا ہے' لہٰذا صحیحین کی اکثر روایات متواتر ہیں اور بعض اوقات جم غفیر کی خبر کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ (۲۷) خدا کے دین میں ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے قرآن مجید اور حدیث کے ذریعہ میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا کیونکہ دونوں دین ہیں۔ دونوں سند سے نقل ہوئے ہیں' دونوں سند ہی سے حجت قرار پاتے ہیں اور دونوں سند ہی کی بنیاد پر قطعی ہیں۔

باقی صحیح موقف یہ ہے کہ قرآن بھی قطعی ذریعے سے ثابت ہے اور حدیث بھی' اور وہ قطعی ذریعہ سند ہے۔ نمبروں کے کھیل کا تعلق اس تصورِ دین سے ہے جسے انسانوں نے بنایا ہے۔ اگر نمبروں کی گیم اتنی ہی اہم ہوتی تو

اللہ عزوجل قرآن مجید میں ہی امت کو حکم دے دیتے کہ جب تک چار، دس، سترہ، تیس، چالیس، ستر، سو، تین سو تیرہ وغیرہ جتنی تعداد سے قرآن نہ سن لینا، اس وقت تک اس کے قرآن ہونے پر ایمان نہ لانا۔ جن لوگوں نے متواتر کی اصل تعداد کو بنایا ہے، وہ آج تک یہ واضح نہ کر سکے کہ چار سے تواتر حاصل ہوتا ہے، دس سے، سترہ سے، تیس سے، چالیس سے، ستر سے، سو سے، تین سو تیرہ سے، کتنوں سے؟ پھر تواتر کے لیے مطلوب تعداد کے اثبات کے لیے جو دلائل بیان کیے گئے ہیں، وہ بھی غیر متعلق ہیں، جیسا کہ جن لوگوں کا قول ہے کہ پانچ سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ اولوالعزم رسول پانچ ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ سات سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ اصحابِ کہف سات تھے۔ جنہوں نے کہا کہ دس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمع قلت کے لیے کم از کم دس افراد کا ہونا شرط ہے۔ جنہوں نے کہا کہ بارہ سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بنی اسرائیل کے نقباء کی تعداد بارہ تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ چالیس سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ جمعہ قائم کرنے کے لیے چالیس افراد کا ہونا معتبر ہے۔ جنہوں نے کہا کہ ستر افراد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے ملاقات کے لیے اپنی قوم میں ستّر افراد کا انتخاب کیا تھا۔ اور جنہوں نے کہا کہ تین سو تیرہ کی تعداد سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اصحابِ بدر کی تعداد اتنی تھی۔ اور جنہوں نے کہا کہ سات یا چودہ سو سے تواتر حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ بیعت رضوان میں اتنے لوگ تھے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ (۲۸)

اگر خبر واحد سے دین کی قطعیت ثابت نہ ہوتی تو اللہ عزوجل ہر قوم کی طرف ایک رسول کیوں بھیجتے؟ اور رسول کی طرف وحی بھی ایک ہی فرشتہ کیوں لے کر آتا؟ پس اللہ کے رسول ﷺ کی خبر جو کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دی ہے، متواتر ہے، اس معنی میں کہ اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے کہ قرآن مجید بھی اللہ کے رسول ﷺ کی خبر واحد ہی ہے۔ تواتر اگر محض معلومات (information) کے لیے ایک اصطلاح ہے تو ہمیں اصطلاحات سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، جیسا کہ خبر واحد کو تین حصوں میں تقسیم کر دیں: غریب، عزیز اور مشہور۔ لیکن اگر آپ کی اصطلاح سے تصورِ دین بگڑنے لگے تو ہم اس وقت اس اصطلاح کا رد کریں گے۔ لوگوں نے تواتر کی یونانی اصطلاح سے اللہ کے دین کو تقسیم کر دیا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو تقسیم کر دیا، قطعی کو ظنی بنا دیا۔

ایک ایسے دور میں بیٹھ کر قرآن مجید کے متواتر ہونے کی باتیں کرنا جبکہ مصاحف لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہوں، اور بات ہے۔ اور تابعین کے دور میں پہنچ کر یہ بات ثابت کرنا کہ انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن مجید تواتر سے ملا ہے، اور بات ہے۔ وہاں تو ایک دوسرے کی قرآن کی وجہ سے تکفیر ہو رہی تھی۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آذربائیجان اور آرمینیہ کے محاذوں پر سپاہیوں میں قرآن مجید پڑھنے کے بارے میں جو اختلاف ہوا تھا تو سپہ سالار حضرت حُذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اس اختلاف کی اطلاع دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اللہ کی کتاب میں اختلاف کر رہے ہیں لہٰذا ان کو کسی

بات پر جمع کر دیں(۲۹)۔ اس کے بعد جمع عثمانی کا معاملہ ہوا۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ اگر تواتر سے مراد قطعیت ہے تو ہم اس کے قائل ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث دونوں متواتر ہیں' اور اگر مراد تعداد ہے تو آپ بیان کر دیں۔

تابعین کے دور میں اگر قرآن مجید کی کسی آیت کی تحقیق کے لیے کسی کو مکہ یا مدینہ نہیں جانا پڑا تو کسی حدیث کی تحقیق کے لیے بھی نہیں جانا پڑا۔ خلافت راشدہ میں جب ایک تابعی ایک صحابی سے قرآن مجید سنتے تھے' تو اس کے قرآن مجید ہونے کا ایمان رکھتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ جب تک ایک تابعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جم غفیر سے قرآن مجید نہیں سن لیتا تھا تو اس وقت تک اسے قرآن مجید نہیں مانتا تھا۔ خیر القرون کے بعد جب تحقیق کا دور شروع ہوا تو قرآن اور حدیث دونوں کی تحقیق ہوئی۔ ''طبقات المحدّثین'' مرتب ہوئیں تو ''طبقات القراء'' بھی لکھی گئی۔ جب احادیث کی چھانٹی ہوئی تو قرآن بھی چھانٹ کر مرتب ہوا' اسی لیے تو موضوع' شاذ' ضعیف اور حسن قراءات وجود میں آئیں(۳۰)۔ یہ تو تاریخ قرآن کے موضوع کی بہت ہی بنیادی بات ہے۔ باقی ہمیں یہ فرق ضرور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کے نقل میں تلقّی وتلاوت تھی جبکہ حدیث میں تحمل واداء۔ تلقی وتلاوت میں الفاظ اصل ہیں جبکہ تحمل واداء میں معنی کی اہمیت ہے۔ حدیث میں نہ تلقی تھی اور نہ ہی تلاوت۔ البتہ قرآن مجید اور حدیث دونوں کے منتقل ہونے کا ذریعہ ایک ہی تھا اور وہ قطعی سند تھی۔

ایک اور طرح سے بات کو سمجھیں تو یوں ہے کہ خبر میں دو پہلو ہوتے ہیں: جھوٹ اور سچ۔ جب ایک پہلو متعین ہو جائے تو اسے کہتے ہیں کہ خبر قطعی ہو گئی ہے' یعنی دوسرا پہلو قطع ہو گیا' ختم ہو گیا۔ اور قطعیت کے لیے تعداد کا ہونا ضروری نہیں ہے' بس یہی ہمارا مقدمہ ہے۔ مثال کے طور پر آج میرے لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ''الموطأ'' کی خبر قطعی ہے کہ اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے امام نافع رحمۃ اللہ علیہ کی خبر قطعی ہے۔ امام نافعؒ کے لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خبر قطعی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر قطعی ہے۔ پس میں تواتر کو مان رہا ہوں' لیکن یہ کہہ رہا ہوں کہ اس میں تعداد اصل نہیں ہے۔ اگر آپ تعداد کو نکال دیں تو مجھ میں اور آپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے' لیکن اگر آپ تعداد پر حسّاس ہیں تو تعداد پھر آپ ہی بیان کریں گے کہ جس سے تواتر حاصل ہوتا ہے اور اس تعداد سے تواتر حاصل ہونے کی عقلی ونقلی دلیل بھی آپ کے ذمے ہے۔ اگر آپ کے نزدیک تعداد بھی تواتر کے مفہوم میں شامل ہے تو فرق یہ پڑے گا کہ میرے نزدیک تواتر ایک سے بھی حاصل ہو جائے گا' جبکہ آپ کے نزدیک اس تعداد سے حاصل ہو گا جو آپ لوگ بیان کریں گے۔ پس ہمارے نزدیک تواتر سے مراد قطعیت ہے نہ کہ تعداد' لہٰذا امام مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر ایک متواتر خبر ہے۔ یہ کہنے والا میں پہلا نہیں ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ خبر واحد اور متواتر کی تقسیم ہماری نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تواتر سے مراد قطعیت ہو تو صحیح اصطلاح ہے' اگر تعداد ہو تو لایعنی مصطلح ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قطعیت' خبر کا خاصہ ہو یا مخاطب کا فیصلہ' دونوں صورتوں میں ایک کی خبر سے بھی قطعیت حاصل ہو جاتی ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ خبر تحقیق سے پہلے ظن کا فائدہ دیتی ہے اور تحقیق کے بعد یقین کا۔ بس جسے آپ خبر واحد کہتے ہیں' وہ ہر حال میں قطعی نہیں ہوتی' تحقیق کے بعد

قطعی ہوتی ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ کچھ اخبار آحاد ایسی ہیں جو تحقیق کے بغیر ہی قطعی ہیں اور یہی صحیح معنوں میں متواتر اخبار ہیں' جیسا کہ مالک عن نافع عن ابن عمر۔ چھٹی بات یہ ہے کہ وہ خبر واحد جو کہ محتف بالقرائن ہو' جیسا کہ صحیحین کی خبر واحد ہے یا جس خبر واحد کو تلقّی بالقبول حاصل ہو' تو یہ بھی عامی کے لیے بغیر تحقیق کے قطعی ہے اور صحیح معنی میں یہ بھی متواتر اخبار ہی ہیں۔ ساتویں بات یہ ہے کہ قرآن مجید کیسے ثابت ہوگا' یہ بھی قرآن ہی بیان کرے گا' کیونکہ یہ دین کا سب سے بنیادی موضوع ہے۔ قرآن نے ہمیں یہ کہا ہے کہ اللہ کی کتاب جب تمہیں ایک شخص سے بھی پہنچے تو تم تحقیق کے بعد اس کو قبول کرلو۔ بس اس کے بعد ہمیں کسی خارجی ذریعہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ قرآن مجید کے اثبات کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ قرآن مجید کی بیس روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی بغیر سند کے ثابت کر دیں۔ باقی قرآن کی اسناد کے لیے علامہ ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی ''النشر فی القرء ات العشر'' دیکھ لیں[۳۱]۔ اب چونکہ قراء نے کتابوں میں اسناد نقل کر دی ہیں تو متاخرین کو ضرورت نہیں ہے کہ اسناد پڑھیں پڑھائیں۔ ورنہ علمی طور تو قرآن مجید جہاں بھی پڑھیں گے' اگر روایت حفص بھی پڑھیں تو استاد جی' چاہے حنفی ہوں یا اہل حدیث' شافعی ہوں یا مالکی' پہلے یہ بتائیں گے کہ یہ روایت حفص بھی ''شاطبیہ'' کے طریق سے ہے یا ''طیبہ'' کے طریق سے۔

اور آج بھی شائع شدہ قرآن' قاری قرآن کی تصدیق کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جب تک قاری صاحب تصحیح کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیں' اس وقت تک قرآن مجید شائع نہیں ہوسکتا۔ تو اصل قاری صاحب ہیں نہ کہ لکھا ہوا۔ اور قرآن بھی تو بیس روایات میں سے ایک روایت ہے' یعنی روایت حفص۔ پس جسے آپ قرآن کہتے ہیں' علمی زبان میں وہ قراءتِ عاصم اور روایت حفص ہے۔ باقی آج سند کی ضرورت نہ قرآن مجید کے لیے اس طرح ہے' نہ حدیث کے لیے۔ دورِ تدوین کے بعد تو سند ایک اعزاز ہے۔

علاوہ ازیں اس بات کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کیا صحابہؓ کے لیے خبر واحد سے ثابت شدہ شریعت قطعی تھی اور ہمارے لیے ظنی؟ آپ ﷺ کی مجلس میں جب ایک صحابی کسی حدیث کو سنتا اور اپنے گھر' محلے اور قبیلے میں جا کر وہ حدیث بتلاتا تو کیا مخاطبین کے لیے قطعی دین ثابت ہو رہا تھا یا ظنی؟ اسی طرح اگر اکیلا صحابی قرآن مجید کی تدوین سے پہلے اپنے شہر کے لوگوں کو قرآن مجید پڑھائے وہ تو قطعی ہے اور اگر حدیث بتلائے تو وہ ظنی ہے؟ پس ایسا نہیں ہے کہ واسطہ بڑھ جانے سے ایک چیز قطعی سے ظنی بن جائے کہ قطعیت شے کا خاصہ ہے نہ کہ واسطے کا۔ اور اسی طرح ایسا بھی نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک شخص نقل کرے تو وہ تو قطعی کہلائے لیکن حدیث کو ایک شخص نقل کرے تو وہ ظنی کہلائے۔

ایک صحابی جب اللہ کے رسول ﷺ سے قرآن مجید کی آیات یا کوئی سورت سیکھتے تھے اور اپنے گھر میں اپنی اہلیہ کو جا کر سناتے تھے تو ان کی اہلیہ کے لیے قرآن مجید کی وہ آیات یا سورت اسی قطعیت کے ساتھ ثابت ہو رہی تھی جس قطعیت کے ساتھ اس صحابیٔ رسول ﷺ کے لیے۔ مانا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خبر واحد کی صورت میں ملنے والے قرآن مجید کے بارے میں لوگ آپ ﷺ سے تصدیق کر سکتے تھے کہ یہ قرآن مجید ہے

بھی یا نہیں، لیکن کیا کسی نے ایسی تصدیق کی؟ پس یہ کہنا کہ یہ ہوسکتا تھا' فلاں کر سکتے تھے' تو بھئی! ہوسکتا تھا' کر سکتے تھے' کوئی دلیل ہے کیا؟ کیا ہوا ہے' وہ بیان کریں۔ ورنہ تو ہر صحابی کا ہر فعل حجت بن جائے گا۔ پس قرونِ اولیٰ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے جس ذریعہ سے قرآن مجید ثابت ہوتا تھا' اسی سے حدیث بھی ثابت ہوتی تھی۔ ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ اور وہ ذریعہ سند ہے' بس!

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر دو چار روایات میں ایک دوسرے سے روایت کو قبول نہیں کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ ایک دوسرے سے قرآن کو بھی قبول نہ کیا۔ آرمینیہ اور آذربائیجان کی جنگوں میں ایک دوسرے کے قرآن ہی کا تو انکار ہو رہا تھا۔ تو کیا اس انکار سے قرآن مجید ظنی ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں! آپ پہلے قطعی کا مفہوم ہضم کر لیں اور اس پر غور کر لیں کہ قطعیت خبر کا خاصہ ہے یا مخاطب کا فیصلہ۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ قطعی اور ظنی کی تقسیم نہیں ہے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید قطعی اور حدیث ظنی ذریعے سے ثابت ہے۔ اللہ کے دین میں یہ تقسیم غلط ہے۔

اور قطعیت کے لیے اجماع کا ہونا ضروری نہیں ہے کہ قرآن مجید اس وقت بھی قطعی تھا جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس کے بارے میں اختلافات ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے رخصت ہوئے تو قرآن پر اجماع نہیں تھا۔ اگر اس وقت قرآن مجید پر اجماع ہوتا تو جمع وتدوینِ قرآن کی ساری کہانی اور اس کی وجوہات واسباب سب کو جھوٹ تسلیم کرنا ہوگا۔ اجماع مصحفِ عثمانی پر ہوا ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں۔ اس سے پہلے قرآن مجید پر بہت اختلاف تھا' جیسا کہ صحیح روایات میں موجود ہے۔ اس کے بیان کے لیے ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب المصاحف'' کافی ہے (۳۲)۔ لیکن اس اختلاف کا یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن مجید قطعی نہیں تھا۔

اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ حدیث بھی دین ہے۔ جب یہ مان لیا تو اب پروردگار مجھے آدھا دین قطعی ذریعے سے دے اور آدھا ظنی ذریعے سے' یہ رانگ نمبر ہے۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی ہر دور میں قطعی سند سے ثابت ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ یہی تاریخی حقیقت بھی ہے اور فرد پر اتمامِ حجت کے لیے پروردگار کی دلیل بھی۔

یہ عقیدہ قطعی ہے یا ظنی؟

مکتبِ فراہی اور فکرِ غامدی سے متاثر لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا' حالانکہ ایسی بات سلف صالحین میں سے کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ روایتی مکاتبِ فکر میں خبر واحد جس طرح فقہی اعمال کا مصدر ہے' اسی طرح دینی عقائد کا بھی ماخذ ہے۔ البتہ ان میں اس بارے اختلاف ہے کہ خبر واحد سے جو عقائد ثابت ہوتے ہیں' وہ قطعی ہیں یا ظنی؟ ہماری رائے میں خبر واحد سے ثابت شدہ عقائد قطعی ہیں کہ وہ عقیدہ ہی کیا ہے کہ جو ظن پر قائم ہو۔ عقیدہ اور اس کا ظنی ہونا' یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر وہ ظنی ہے تو وہ عقیدہ نہیں ہے اور اگر عقیدہ ہے تو ظنی نہیں ہوسکتا۔ چاہے آپ بغیر سوچے سمجھے زبان سے اس کو ظنی کہہ رہے ہوں لیکن آپ کا عمل اس کی قطعیت کی گواہی دے رہا ہوگا۔

وہ عقیدہ ہی کیا کہ جسے شک لاحق ہو؟ اور ظن تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں شک کا پہلو مغلوب ہو۔ البتہ شک اور شبہہ میں فرق ہے کہ شبہ عارضی ہوتا ہے' لہٰذا ایک حال ہے نہ کہ صفت' جبکہ شک تو ایسا خلجان ہے کہ جس میں سلب و ایجاب میں سے کوئی بھی پہلو غالب نہ ہو سکے۔ مؤمن کو شبہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن وہ شک میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ امام مالک' امام شافعی' امام احمد' امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہم اور حنفیہ کی ایک جماعت کے نزدیک خبر واحد سے علم یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ظن۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب سوال کیا گیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خبر واحد سے عمل تو واجب ہو جاتا ہے لیکن اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے یہ بات لے آئے ہیں! (۳۳)

خبر واحد سے کون سے اسلامی عقائد ثابت ہوتے ہیں؟ ذرا اس پر ہم کچھ روشنی ڈال دیتے ہیں۔ پھر جو ان عقائد کو ظنی سمجھتے ہیں' وہ ذرا اس پر غور کر لیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے بھی یا نہیں!

- اللہ کے نبی ﷺ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔
- میدانِ محشر میں اللہ کے نبی ﷺ شفاعت کریں گے۔
- اللہ کے نبی ﷺ کے معجزات جو احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔
- انسان اور کائنات کی ابتدا' جِنّات اور فرشتوں کی صفات' جنت اور جہنم کی صفات۔
- عشرہ مُبشرہ جنتی ہیں۔
- قیامت والے دن جو میزان لگایا جائے گا' اس کے دو پلڑے ہوں گے۔
- حوضِ کوثر پر ایمان' اور اس پر ایمان کہ جو حوضِ کوثر سے پانی پیے گا' کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔
- قلم پر ایمان اور اس پر کہ قلم نے ہر شے کو لکھ دیا ہے۔
- اس پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کا جسم زمین پر حرام کر دیا ہے۔
- امام مہدی کے خروج' دجال کی آمد' اور عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر ایمان۔
- اللہ کے نبی ﷺ کے آسمانوں پر جانے اور اللہ کی ان نشانیوں پر ایمان جن کے دیکھنے کا ذکر آپ ﷺ نے اپنی احادیث میں کیا۔ وغیرہ۔

حدیث کی درایتی تحقیق

حدیث کی درایتی تحقیق کی معاصر تحریک کو اس بارے میں دو بنیادی غلط فہمیاں لاحق ہوئیں۔ ایک یہ کہ ان کا خیال ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایتی تحقیق کی ہے جبکہ درایتی نہیں' لہٰذا ہمیں حدیث کی درایتی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چند واقعات میں قلتِ تدبّر کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صحابہ بھی درایت بمعنی عقل کی بنیاد پر احادیث کو رد کر دیتے تھے۔

پہلی غلط فہمی تو صحیح حدیث کی شرائط پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے احادیث کی روایت اور درایت دونوں اعتبارات سے جانچ پڑتال کی ہے۔ صحیح حدیث کی پہلی تین شرائط کا تعلق روایت اور

آخری دو کا درایت سے ہے کہ شذوذ اور علت کی بحث متن میں زیادہ ہوتی ہے۔ اور علت کی بیسیوں قسمیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق متن سے ہوتا ہے اور اس کا اندازہ ''کتب العلل'' کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔ پس محدثین نے احادیث کی اسناد اور متن دونوں کی تحقیق کے اصول وضع کیے اور ان دونوں پر اخبار آحاد کی جانچ پڑتال کی ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ درایت یعنی متن کی تحقیق کا معنی و مفہوم محدثین کے ہاں کچھ اور ہے اور مکتب فراہی اور ان کے متاثرین کے ہاں کچھ اور ہے۔

ہمارے استاذ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان ''علمِ حدیث میں اسناد و متن کی تحقیق کے اصول'' میں استدراکاتِ صحابہ پر بہت عمدہ عقلی و منطقی گفتگو فرمائی ہے اور معاصر محققین میں سے مولانا فراہیؒ، مولانا اصلاحیؒ، غامدی صاحب، پروفیسر تقی امینی صاحب اور جناب عمار خان ناصر صاحب کے حدیث کی درایتی تحقیق کے بارے میں نظریات کا خوب تعاقب فرمایا ہے۔

دوسری غلط فہمی کی بنیاد دوہرا معیارِ فہم ہے۔ یعنی جب پہلے سے ذہن میں یہ طے ہو کہ ہم نے ان احادیث کو قبول نہیں کرنا تو انسانی ذہن قابل توجیہہ واقعات میں بھی اعتراضات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی کام مستشرقین میں سے نولڈکے، رچرڈ بیل اور آرتھر جیفری نے قرآن مجید کے ساتھ کیا ہے اور انہوں نے قرآن مجید کے متن کی تحقیق اس کے متن سے کی ہے جسے وہ ''انتقاد اعلیٰ کے اصول'' (Principles of Higher Criticism) کا نام دیتے ہیں۔ مستشرقین کی ایک جماعت قرآن مجید کی درایتی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ہے[٣٤]۔ اور ہم ان مستشرقین کے اعتراضات کے بھی جوابات اپنی ایک مستقل تصنیف میں دے چکے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں کہنا کہ حدیث کی درایتی تحقیق کا مطالبہ کرنے والے مستشرقین سے متاثر ہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ جب انسانی ذہن پہلے سے ایک متن (text) کے مقام اور مرتبے کا تعین کر چکا ہوتا ہے تو اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی درایتی تحقیق کے دعویٰ کے نتیجے میں قرآن مجید کا انکار اور حدیث کی درایتی تحقیق کے دعویٰ کے نتیجے میں احادیث کا انکار کرنے والوں کا سوچنے کا انداز بالکل ایک جیسا ہے، یعنی ان کے ذہنی پیٹرن ملتے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ دونوں کی تحقیق ان کے خیال میں غیر جانبدارانہ ہے۔ حدیث کے معاصر درایتی محققین کا بس یہ ایمان ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی درایتی تحقیق نہیں کرنی ہے، ورنہ وہ بھی مستشرقین کے نتائج کے حامل ہوں گے۔ لہٰذا یہ درایتی محققین جب قرآن مجید کے معاملے میں ویسے ہی جانبدار ہیں جیسا کہ روایت پسند حدیث کے معاملے میں، تو یہ روایت پسندوں کو حدیث کے معاملے میں جانبداری کا طعنہ کیسے دے سکتے ہیں؟

ایک مُلحد سے احادیث کے معانی پر مکالمہ

ملحد (atheist) کس طرح احادیث کو اپنے معانی پہناتے ہیں تو اس بارے میں راقم اور ایک ملحد غلام رسول کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ راقم نے اس مکالمے کو تصویری شکل میں اپنی فیس بک وال پر شیئر کیا ہے۔ غلام

رسول' ظاہری بات ہے کہ فیس بک پر اس ملحد کا فرضی نام ہے جبکہ وہ ایک ملحدانہ فیس بک پیج کا ایڈمن ہے اور فیس بک کی دنیا میں کافی معروف شخصیت ہے۔ غلام رسول صاحب نے اپنے پیج پر ایک حدیث شیئر کی کہ جس میں حدیث کا ترجمہ ایسا لگایا جو کہ بنتا نہیں تھا اور اپنے اسی ترجمے سے وہ صاحب اس حدیث میں عریانی اور فحاشی ثابت کر رہے تھے۔

اس مکالمے کا حاصل یہ ہے کہ ملحدین اور منکرین کس طرح حدیثوں کا معنی تبدیل کرتے ہیں اور اپنے ذہن کا گند احادیث سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے اس حدیث کا یہ معنی کیسے کیا ہے؟ گرامر اور زبان کے کن اصول وضوابط کی روشنی میں کیا ہے؟ تو امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ معنی کیوں کیا ہے؟

پس اگر آپ احادیث کا صحیح ترجمہ کر دیں تو محض صحیح ترجمہ بیان کر دینے سے ملحد اور منکرِ حدیث کا وہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ جسے وہ اپنے تئیں کوئی علمی اعتراض سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اس کیس میں بھی حدیث پر اعتراض کی صرف ایک ہی بنیاد تھی اور وہ اس ملحد کا کیا ہوا ترجمہ تھا۔ جیسے ہی اس کے ترجمے پر سوالیہ نشان کھڑا ہوا اور وہ اپنے ترجمے سے رجوع کرنے لگا تو حدیث پر سے اعتراض بھی رفع ہو گیا۔ ملحد کا ترجمہ یہ تھا:

''عروہ بن الزبیر سے روایت ہے' حضرت عائشہؓ نے کہا: مجھے معلوم نہ ہوا کہ اچانک زینب بنت جحش میرے گھر بغیر اجازت کے آ گئیں' وہ غصہ میں تھیں۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ میں سمجھتی ہوں جب ابوبکر کی چھوکری اپنی قمیض الٹے تو وہ آپ ﷺ کو کافی ہے۔'' (۳۵)

جبکہ اس حدیث کا عربی متن یہ ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، قَالَ :قَالَتْ عَائِشَةُ :مَا عَلِمْتُ حَتّٰى دَخَلَتْ عَلَيَّ زَيْنَبُ بِغَيْرِ اِذْنٍ وَهِيَ غَضْبَى ، ثُمَّ قَالَتْ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَحَسِبْتَ اِذَا قَلَبَتْ بُنَيَّةُ اَبِي بَكْرٍ دُرَيْعَتَيْهَا(۳۶)

ملحد نے اس روایت میں موجود ''بُنَيَّةُ'' کے لفظ کا ترجمہ چھوکری اور ''دُرَيْعَتَيْهَا'' کا ترجمہ قمیص کیا ہوا ہے؟ جب میں نے ملحد کو اس بات پر پکڑا کہ چھوکری کس عربی لفظ کا ترجمہ کیا ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میں نے تو فلاں مترجم سے ترجمہ لیا ہے۔ میں نے کہا کہ جو ترجمہ آپ نے کیا ہے' وہ کسی ایک مترجم سے دکھا دو۔ اب اسے وہ بھی نہ ملے۔ دراصل اس نے کیا یہ تھا کہ مختلف ترجموں کو ملا کر ایک ترجمہ بنا لیا تھا۔ یعنی جس ترجمے میں اس کے ذہنی گند کے مناسب کوئی لفظ اسے مل گیا' اس نے وہ اٹھا لیا اور ایک ترجمہ بنا لیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث کی کتابوں کے مترجمین کو الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کرنی چاہیے کہ اسلام مخالفین عناصر ان کے تراجم کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور ہماری رائے میں کتب احادیث کے بہت سے تراجم پر نظر ثانی (revision) کی ضرورت ہے' کیونکہ اس کی کافی ساری مثالیں ہیں کہ حدیث کا مناسب ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ملحدین اور منکرین کو اعتراض کا موقع مل گیا' جیسا کہ کچھ مثالیں ہم آگے چل کر بھی بیان کریں گے۔

منکرینِ حدیث کی شطحیات

منکرینِ حدیث' حدیث کے انکار میں کس حد تک اخلاقی اور علمی طور پر گر سکتے ہیں کہ اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انعام رانا صاحب [۳۷] نے اپنی فیس بک وال پر ڈاکٹر شبیر احمد کے حوالے سے کچھ ایسی احادیث نقل کی ہیں کہ جو ان کی نظر میں واہیات احادیث ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جو انہوں نے بیان کی ہے:

''ایک شخص نے حضور (ﷺ) سے تنہا ہونے کی شکایت کی۔ کہا کبوتری کو زوجہ بنالو!'' [۳۸]

اب یہ صاحب اپنی وال پر یہ نقل کر کے عام لوگوں کو یہ کہہ رہے ہیں کہ احادیث پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی باتوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال مان لو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان صاحب کو اس کتاب کا صحیح نام بھی لکھنا نہیں آتا کہ جہاں سے وہ حدیث نقل کر رہے ہیں۔ چلیں! مان لیا کہ ٹائپنگ کی غلطی ہے' لیکن اگر کتاب کا مکمل نام نقل کر دیتے تو وہ فحش غلطی نہ کرتے جو کہ یہ کر چکے ہیں۔ اس کتاب کا مکمل نام ''المنار المنیف فی الصحیح و الضعیف'' ہے کہ جس میں امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف احادیث کو صحیح سے علیحدہ کیا ہے۔

اب امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے کہ کبوتروں کے بارے میں تمام روایات ضعیف اور موضوع ہیں اور اس کے بعد انہوں نے ان ضعیف اور موضوع روایات کا ذکر کیا ہے جو کبوتروں کے بارے میں نقل ہوئی ہیں۔ جناب ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے یہ روایت بغیر سمجھے اٹھالی ہے اور اب ان کے مقلدین بھی بغیر سمجھے اسے نقل کیے جا رہے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جواب دو ناں! جواب دو ناں! کی رٹ لگا رکھی ہے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

فَصْلٌ فِی ذِکْرِ جَوَامِعِ وَضَوَابِطِ کُلِّیَّةٍ فِی هَذَا الْبَابِ: فَمِنْهَا أَحَادِیثُ الْحَمَامِ۔ بِالتَّخْفِیفِ۔ لا یَصِحُّ مِنْهَا شَیْءٌ ۔ وَمِنْهَا حَدِیثِ "کَانَ یُعْجِبُهُ النظر إلی الحمام". وَحَدِیث "کَانَ یُحِبُّ النَّظَرَ إِلَی الْخُضْرَةِ وَالْأُتْرُجِ والحمام الأحمر" وَحَدِیث "شَکَا رَجُلٌ إِلَی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ الْوَحْدَةَ، فَقَالَ لَهُ :لَوِ اتَّخَذْتَ زَوْجًا مِنَ حَمَامٍ فَآنَسَكَ وَأَصَبْتَ مِنْ فراخه" [۳۹]

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب ''الموضوعات'' میں نقل کیا ہے۔ اور اگر اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو جائے تو یقین مانیے کہ حدیث پر اعتراض کرنے والوں کا بنیادی مصدر قرار پائے کہ کتاب کے نام اور موضوع پر غور کیے بغیر تھوک کے حساب سے حدیثوں پر اعتراضات کا ریکارڈ قائم کر دیں۔ اب معلوم نہیں' ان منکرین کو ہماری یہ بات سمجھ بھی آئی ہے یا نہیں! یہ منکرین جن احادیث پر اعتراضات قائم کرتے ہیں' ان کی بڑی تعداد ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہے کہ جنہیں پہلے ہی سے امت نے رد کر رکھا ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، قرآن مجید میں قراءتوں کا اختلاف، ماہنامہ رشد، ستمبر ۲۰۰۹، مجلسِ تحقیقِ اسلامی، لاہور، ص ۴۸۔۴۹

(۲) نعیم الرحمٰن ناصف، حافظ، رشد قراءات نمبر اور منکرینِ حدیث کی بوکھلاہٹ، ماہنامہ رشد، مارچ ۲۰۱۰ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص ۱۴

(3) Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from https://archive.org/details/standard1-quran

(4) Al-Quran Al-Kareem bi Riwayat e Warsh, Retrieved 01 November, 2016 from http://ia601606.us.archive.org/14/items/QRaaNT/QRaaNTH.pdf

(٥) على بن سليمان العبيد، الدكتور، جمع القرآن الكريم حفظا وكتابة، مجمع الملك فهد، المدينة المنورة، ص ٥٥

(٦) العنكبوت: ٤٩

(٧) مصطفى بن حسنى السباعى (المتوفى١٣٨٤هـ)، السنة ومكانتها فى التشريع الإسلامى، المكتب الإسلامى، دمشق، الطبعة الثالثة، ١٤٠٢هـ/١٩٨٢م، ص ٣٨٠

(٨) البقرة: ٢٦

(٩) وَأَمَّا مَعْنَاهَا شَرْعًا: أَىْ: فِى اصْطِلَاحِ أَهْلِ الشَّرْعِ فَهِىَ: قَوْلُ النبى ﷺ وَفِعْلُهُ وَتَقْرِيرُهُ (الشوكانى، محمد بن على بن محمد بن عبد الله اليمنى (المتوفى: ١٢٥٠هـ)، إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول، دار الكتاب العربى، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ - ١٩٩٩م، ١/٩٥)

(١٠) فَحَقِيقَةُ الرِّوَايَةِ :نَقْلُ السُّنَّةِ وَنَحْوِهَا وَإِسْنَادُ ذَلِكَ إِلَى مَنْ عُزِىَ إِلَيْهِ بِتَحْدِيثٍ أَوْ إِخْبَارٍ أَوْ غَيْرِ ذَلِكَ (السيوطى، عبد الرحمٰن بن أبى بكر، جلال الدين (المتوفى: ٩١١هـ)، تدريب الراوى فى شرح تقريب النواوى، دار طيبة، الرياض، ١/٢٦)

(١١) اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر حدیث، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ١٩٩٤ء، ص ١٩، ٢٨

(١٢) غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد، لاہور، ٢٠٠٩ء، ص ١٣۔١٥

(١٣) أبو الفتح عثمان بن جنى الموصلى (المتوفى:٣٩٢هـ)، المحتسب فى تبيين وجوه شواذ القراءات والإيضاح عنها، وزارة الأوقاف- المجلس الأعلى للشئون الإسلامية، المملكة العربية السعودية، ١٤٢٠هـ/ ١٩٩٩م

(١٤) مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيرى النيسابورى (المتوفى٢٦١هـ)، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول اللهﷺ، دار إحياء التراث العربى، بيروت، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَابُ التَّثَبُّتِ فِى الْحَدِيثِ وَحُكْمِ كِتَابَةِ الْعِلْمِ، ٤/٢٢٩٨

(١٥) أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق الأزدى (المتوفى٢٧٥هـ)، سنن أبى داؤد، المكتبة العصرية، بيروت، كِتَاب الْعِلْمِ، بَابٌ فِى كِتَابِ الْعِلْمِ، ٣/٣١٨

(١٦) محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخارى الجعفى، صحيح البخارى، دار طوق النجاة، مصر، الطبعة الأولى، ١٤٢٢هـ، كِتَاب فِى اللُّقَطَةِ، بَابُ كَيْفَ تُعَرَّفُ لُقَطَةُ أَهْلِ مَكَّةَ، ٣/١٢٥

(۱۷) صحيح البخارى، كِتَابُ العِلْمِ، بَابُ كِتَابَةِ العِلْمِ، ۳٤/۱

(۱۸) صحيح البخارى، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ فَكَاكِ الأَسِيرِ، ٦۹/٤

(۱۹) محمد عجاج بن محمد تميم بن صالح بن عبد اللّٰه الخطيب، السنة قبل التدوين، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثالثة، ۱٤۰۰هـ ۱۹۸۰م، ص ۳٤۸۔۳٦۱

(۲۰) الحسين بن على بن محمد بن جعفر، أبو عبد اللّٰه الصَّيْمَرى الحنفى (المتوفى٤۳٦هـ)، أخبار أبى حنيفة وأصحابه، دار عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية، ۱٤۰٥هـ ۱۹۸٥م، ص ۲٤

(۲۱) ابن قيم الجوزية، محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى۷٥۱هـ)، إعلام الموقعين عن رب العالمين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ۱٤۱۱هـ ۱۹۹۱م، ۹٤/٤

(۲۲) السيوطى،عبد الرحمن بن أبى بكر، جلال الدين (المتوفى۹۱۱هـ)، الإتقان فى علوم القرآن، الهيئة المصرية العامة للكتاب، مصر، ۱۳۹٤هـ/۱۹۷٤م، ۲٥۸/۱

(۲۳) جیسا کہ طبقات القراء کے بیان میں علامہ ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''غاية النهاية فى طبقات القراء'' اور امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب ''معرفة القراء الكبار على الطبقات والأعصار'' معروف ہیں۔

(۲٤) ابن الجزرى، شمس الدين أبو الخير محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى۸۳۳هـ)، منجد المقرئين ومرشد الطالبين، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، ۱٤۲۰هـ ۱۹۹۹م، ص ۱۸

(۲٥) یہ مکالمہ راقم اور مولانا زاہد صدیق مغل صاحب کے مابین فیس بک پر ہوا تھا۔ اس مکالمے میں اگرچہ بعد دوسرے حضرات کے کمنٹس بھی آ گئے، جیسا کہ جناب قاری حنیف ڈار صاحب، جناب عمار خان ناصر صاحب، جناب ڈاکٹر خضر یاسین صاحب، جناب محمد حسن صاحب، مولانا سرفراز فیضی صاحب، جناب شکیل بن حسن صاحب، جناب محمد امجد مغل صاحب وغیرہ، لیکن اصلاً یہ میرے اور زاہد مغل صاحب کے مابین ہی رہا۔ یہ مکالمہ مولانا زاہد صدیق مغل صاحب کی وال پر موجود ہے۔ میں نے وہاں سے بعینہٖ اٹھا کر اس کی امیج بنا کر اپنی وال پر تصویر کے طور پر پبلش کر دیا ہے۔ اور یہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲٦) وَمِنَ الْمَشْهُورِ :الْمُتَوَاتِرُ الَّذِى يَذْكُرُهُ أَهْلُ الْفِقْهِ وَأُصُولِهِ، وَأَهْلُ الْحَدِيثِ لَا يَذْكُرُونَهُ بِاسْمِهِ الْخَاصِّ الْمُشْعِرِ بِمَعْنَاهُ الْخَاصِّ، وَإِنْ كَانَ الْحَافِظُ الْخَطِيبُ قَدْ ذَكَرَهُ، فَفِى كَلَامِهِ مَا يُشْعِرُ بِأَنَّهُ اتَّبَعَ فِيهِ غَيْرَ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَلَعَلَّ ذَلِكَ لِكَوْنِهِ لَا تَشْمَلُهُ صِنَاعَتُهُمْ، وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِى رِوَايَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ عِبَارَةٌ عَنِ الْخَبَرِ الَّذِى يَنْقُلُهُ مَنْ يَحْصُلُ الْعِلْمُ بِصِدْقِهِ ضَرُورَةً، وَلَا بُدَّ فِى إِسْنَادِهِ مِنِ اسْتِمْرَارِ هَذَا الشَّرْطِ فِى رُوَاتِهِ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى مُنْتَهَاهُ .وَمَنْ سُئِلَ عَنْ إِبْرَازِ مِثَالٍ لِذَلِكَ فِيمَا يُرْوَى مِنَ الْحَدِيثِ أَعْيَاهُ تَطَلُّبُهُ .(ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، أبوعمرو، تقى الدين (المتوفى٦٤۳هـ)، معرفة أنواع علوم الحديث، ويُعرف بمقدمة ابن الصلاح، دار الفكر المعاصر، بيروت، ۱٤۰٦هـ ۱۹۸٦م، ص ۲٦۸۔۲۷٦)

(۲۷) وَأَمَّا الْمُتَوَاتِرُ فَالصَّوَابُ الَّذِى عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ: أَنَّ الْمُتَوَاتِرَ لَيْسَ لَهُ عَدَدٌ مَحْصُورٌ بَلْ إِذَا حَصَلَ الْعِلْمُ عَنْ إِخْبَارِ الْمُخْبِرِينَ كَانَ الْخَبَرُ مُتَوَاتِرًا وَكَذَلِكَ الَّذِى عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ أَنَّ الْعِلْمَ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ حَالِ الْمُخْبِرِينَ بِهِ .فَرُبَّ عَدَدٍ قَلِيلٍ أَفَادَ خَبَرُهُمُ الْعِلْمَ بِمَا يُوجِبُ صِدْقَهُمْ وَأَضْعَافُهُمْ لَا يُفِيدُ خَبَرُهُمُ الْعِلْمَ؛ وَلِهَذَا كَانَ الصَّحِيحُ أَنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ قَدْ يُفِيدُ الْعِلْمَ إِذَا احْتَفَّتْ بِهِ قَرَائِنُ تُفِيدُ الْعِلْمَ .وَعَلَى هَذَا فَكَثِيرٌ مِنْ

مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مُتَوَاتِرُ اللَّفْظِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ وَإِنْ لَمْ يَعْرِفْ غَيْرُهُمْ أَنَّهُ مُتَوَاتِرٌ؛ وَلِهَذَا كَانَ أَكْثَرُ مُتُونِ الصَّحِيحَيْنِ مِمَّا يَعْلَمُ عُلَمَاءُ الْحَدِيثِ عِلْمًا قَطْعِيًّا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَهُ تَارَةً لِتَوَاتُرِهِ عِنْدَهُمْ وَتَارَةً لِتَلَقِّي الْأُمَّةِ لَهُ بِالْقَبُولِ .وَخَبَرُ الْوَاحِدِ الْمُتَلَقَّى بِالْقَبُولِ يُوجِبُ الْعِلْمَ عِنْدَ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَد وَهُوَ قَوْلُ أَكْثَرِ أَصْحَابِ الْأَشْعَرِيِّ كالإسفراييني وَابْنِ فورك؛ فَإِنَّهُ وَإِنْ كَانَ فِي نَفْسِهِ لَا يُفِيدُ إلَّا الظَّنَّ؛ لَكِنْ لَمَّا اقْتَرَنَ بِهِ إجْمَاعُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ عَلَى تَلَقِّيهِ بِالتَّصْدِيقِ كَانَ بِمَنْزِلَةِ إجْمَاعِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْفِقْهِ عَلَى حُكْمٍ مُسْتَنِدِينَ فِي ذَلِكَ إلَى ظَاهِرٍ أَوْ قِيَاسٍ أَوْ خَبَرٍ وَاحِدٍ فَإِنَّ ذَلِكَ الْحُكْمَ يَصِيرُ قَطْعِيًّا عِنْدَ الْجُمْهُورِ وَإِنْ كَانَ بِدُونِ الْإِجْمَاعِ لَيْسَ بِقَطْعِيِّ؛ لِأَنَّ الْإِجْمَاعَ مَعْصُومٌ فَأَهْلُ الْعِلْمِ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ لَا يَجْمَعُونَ عَلَى تَحْلِيلِ حَرَامٍ وَلَا تَحْرِيمِ حَلَالٍ كَذَلِكَ أَهْلُ الْعِلْمِ بِالْحَدِيثِ لَا يُجْمِعُونَ عَلَى التَّصْدِيقِ بِكَذِبِ وَلَا التَّكْذِيبِ بِصِدْقِ .وَتَارَةً يَكُونُ عِلْمُ أَحَدِهِمْ لِقَرَائِنَ تَحْتَفِ بِالْأَخْبَارِ تُوجِبُ لَهُمْ الْعِلْمَ وَمَنْ عَلِمَ مَا عَلِمُوهُ حَصَلَ لَهُ مِنْ الْعِلْمِ مَا حَصَلَ لَهُمْ .(ابن تيمية'تقى الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحرانى (المتوفى: ٧٢٨هـ)' مجموع الفتاوىٰ' مجمع الملك فهد' المملكة العربية السعودية' ١٤١٦هـ/١٩٩٥م' ١٨/٤١_٤٠)

(٢٨) إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول ١٣٢/١_١٣٣

(٢٩) أَنَّ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ' قَدِمَ عَلَى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِي أَهْلَ الشَّأْمِ فِي فَتْحِ أَرْمِينِيَةَ' وَأَذْرَبِيجَانَ مَعَ أَهْلِ الْعِرَاقِ' فَأَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اخْتِلَافُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ' فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ :يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ' أَدْرِكْ هَذِهِ الْأُمَّةَ' قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الْكِتَابِ اخْتِلَافَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى (صحيح البخارى١٨٣/٦)

(٣٠) الإتقان فى علوم القرآن ٢٥٨/١_٢٨١

(٣١) ابن الجزرى' شمس الدين أبو الخير' محمد بن محمد بن يوسف (المتوفى٨٣٣ هـ)' النشر فى القراء ات العشر' المطبعة التجارية الكبرى' مصر'٥٨_١٩٨

(٣٢) ابن أبى داوٗد' أبو بكر عبد اللّٰه بن سليمان بن الأشعث الأزدى السجستانى (المتوفى٣١٦هـ)' كتاب المصاحف' الفاروق الحديثة' القاهرة' الطبعة الأولىٰ' ١٤٢٣هـ ٢٠٠٢م

(٣٣) ابن قيم الجوزية'محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى٧٥١هـ)' مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة' دار الحديث' القاهرة' الطبعة الأولى' ١٤٢٢هـ ٢٠٠١م' ص ٥٥٣

(34) Harald Motzk, "Alternative accounts of the Quran's formation ", in The Cambridge Companion to the Quran, ed. Jane Dammen McAuliffe, UK: Cambridge University Press, 2006,pp. 59-71

Higher Critical scholarship of the Koran, using methodologies adapted from biblical criticism, is still largely confined to scholars working in Western universities. So sensitive is this area for Muslims that 'Ibn Warraq, a Muslim-born writer trained in Arabic who accepts the findings of radical Western scholarship, has felt it necessary to publish his work under a

pseudonym.)Malise Ruthven, Fundamentalism: A Very Short Introduction, London: Oxford University Press, 2007, p. 49)

As Richard Bell and Montgomery Watt argue in their scholarly Introduction to the Quran: The assumption that God is himself the speaker in every passage leads to difficulties. (Ibid., p. 50)

The Egyptian academic Nasr Abu Zaid, who ventured to use modern literary critical methodology in his approach to the Koran, was forced into exile. Higher criticism of the Koran, where the text is deconstructed in accordance with methods developed by biblical scholars since the 18th century, is still very largely confined to scholars who are not Muslims. Examples include the work of John Wansbrough, Patricia Crone, and Gerald Hawting, Western scholars of Islam who do not accept the traditional view of its origins as related in the earliest texts.(Ibid., pp.40-41)

(35) Retrieved 2 February, 2016 from Pakistani Free Thinkers Facebook Page. For detail please visit my Timeline Hm Zubairpost on 2 February, 2016.

(٣٦) سنن ابن ماجة ٦٣٧/١

(٣٧) پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں' لندن میں مقیم ہیں اور مکالمہ کے نام سے ایک ویب سائیٹ کے ایڈیٹر ہیں۔

(38) Retrieved 2 February, 2016 from Inam Rana Sb Facebook Page. For detail please visit my Timeline"Hm Zubair" post on 2 February, 2016.

(٣٩) ابن قيم الجوزية' محمد بن أبى بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفى ٧٥١هـ)' المنار المنيف فى الصحيح والضعيف' مكتبة المطبوعات الإسلامية' حلب' الطبعة الأولى' ١٣٩٠هـ/١٩٧٠م' ص ١٠٦

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

رشید ارشد صاحب کے مضمون

''مذہبی تجربے کی علمی ونفسیاتی ساخت''

کا جائزہ اور کچھ گزارشات

مدثر رشید

حکمتِ قرآن کے سابقہ شمارے 'جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء' میں محترم رشید ارشد صاحب کا مضمون 'مذہبی تجربے کی علمی ونفسیاتی ساخت' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے علامہ اقبال کے مذہبی تجربے کو طبیعیات کے دائرے میں لانے کی کاوش کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک لحاظ سے جہاں ان کی تنقید فکر انگیز ہے' تو ایک لحاظ سے یہ محلِ نظر بھی ہے۔ ذیل میں اس تنقید کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد مادیت کے نظریے پر استوار ہوتی ہے۔ اس سوچ کے تحت ایک ورلڈ ویو بھی ترتیب دیا گیا ہے اور اسی طرح انسان کا ایک خالص مادی تصور بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس سوچ میں مابعد الطبعی حقائق سے زیادہ اہمیت طبیعی حقائق کی ہے۔ مذہب اور اس سے متعلق حقائق کا تعلق کیونکہ مابعد الطبیعیات سے ہے اس لیے اس کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ رشید ارشد صاحب کے نزدیک اس سوچ سے نمٹنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس جدید سوچ کو ہی رد کر دیا جائے اور اس کے برعکس مذہبی سوچ کو مسلم مان کر اس کی بنیاد پر ایک نیا ورلڈ ویو اور تصور انسان کھڑا کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس جدید سوچ میں مذہبی سوچ کی گنجائش پیدا کی جائے۔ یعنی مابعد الطبعی حقائق کو کسی نہ کسی حد تک طبیعات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ طریقہ وہ تھا جسے علامہ اقبال نے اپنایا۔ رشید ارشد کے نزدیک یہ موزوں طریقہ کار نہیں ہے' کیونکہ اس طرح سے مذہبی سوچ کی کچھ گنجائش تو پیدا کی جا سکتی ہے لیکن مذہب جن حقائق کو واضح طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے ان کو اس لحاظ سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ کاوش رائیگاں جائے گی اور مذہبی نظریات کی عقلی توجیہہ خود مذہب کے ماننے والے قبول نہیں کریں گے۔ رشید ارشد صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ سارا عمل دراصل جدید علمیت episteme کے غلبے کو مان لینے کے بعد شروع ہوا اور اس میں کوشش کی گئی کہ سائنس وغیرہ سے تعمیر ہونے والے جدید ذہن کے لیے مذہب اور مابعد الطبیعیات کو کم از کم اس درجے تک مانوس بنا دیا جائے کہ وہ ان کے انکار کی طرف مائل نہ ہو سکے۔''

اس طریقہ کار کی غلطی واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''انسان کے مذہبی شعور اور وجود کا اثبات کرنے کی ان کوششوں کا نصب العین یہ تھا کہ جدید تصورِ انسان میں کلاسیکی تصورِ انسان کے بعض اجزا شامل ہو جائیں اور انہیں قبول بھی کر لیا جائے۔ اس تحریک میں ایک جوہری نقص تھا' اور وہ یہ کہ انسان اور مذہبی حقائق کے درمیان تعلق کو ثابت کرنے کے لیے جدید تصورِ انسان کو رد نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ اسے کل مان کر مذہبیت کے بعض اجزا کی گنجائش نکالی جا رہی تھی اور ان اجزا کی placing بھی اس تصور کے مرکز میں نہیں کی جا رہی تھی بلکہ انہیں ایک ماتحت اور ثانوی حیثیت دے کر اس نئے تصور میں قدرے توسیع کی کوشش کی جا رہی تھی۔''

ان کے نزدیک فلسفے کے میدان میں تو چونکہ جدید سوچ کی اصل جڑیں موجود تھیں' اس لیے اس میں تو گنجائش پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن نفسیات کے میدان میں کچھ ایسے کام کیے گئے جس سے یہ گنجائش پیدا کرنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس لحاظ سے دو شخصیات نمایاں ہیں' یونگ اور ولیم جیمز۔ یونگ نے تجرباتی تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مابعد الطبیعی تصورات خارج سے تو انسان میں داخل نہیں ہوتے' مگر ان کا وجود ہے اور یہ انسان کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تصورات شعور کے اس حصے سے جنم لیتے ہیں جسے لاشعور بھی کہا جاتا ہے جو انسان کے ادراک سے باہر ہے۔ اگر یونگ کے اس نتیجے کو صحیح مان لیا جائے تو مابعد الطبیعی تصورات بشمول خدا کے تصور کو محض ایک باطنی خیال ہی ثابت کیا جا سکتا ہے' ایک خارجی حقیقت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی ذہن اس تشریح کو قبول کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں' بلکہ مذہب میں تو خدا اور دیگر مذہبی حقائق ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ رشید ارشد صاحب اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس پورے عمل میں مذہب جیسا کہ ہے' اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس سے وجودِ باری تعالیٰ اور رسالت کا ادارہ ادنیٰ درجے میں بھی define نہیں ہوتا۔ اس طرح کی انفسی مذہبیت کچھ روحانی تصورات کا جواز تو فراہم کر دیتی ہے لیکن اس سے مذہب کے تمام ڈھانچے (structures) گر جاتے ہیں اور اس نوع کی روحانیت مذہب کو پوری طرح غیر مطلوب اور غیر متعلق بنا دیتی ہے۔''

ولیم جیمز کے نزدیک مابعد الطبیعی تصورات محض باطنی خیال نہیں ہیں بلکہ ان کی تشکیل خارجی حقائق سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ولیم جیمز نے مابعد الطبیعی تصورات مثلاً مذہب یا خدا کو مستند خارجی معلومات کی بنیاد پر تشکیل شدہ باطنی حقائق کے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسئلہ وہی ہے کہ اس کے ذریعے تو مابعد الطبیعی معلومات کا حصول ہر انسان کے لیے ثابت ہوتا ہے اور نبی اور غیر نبی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت تو علم وحی بھی اسی طرح کے تجربات کی صورت میں پیدا ہونے والا علم ہے۔ اب کیا مذہبی ذہن اس کو تسلیم کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مذہبی سوچ کے تحت تو وحی کا تعلق ان تجربات کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ علم تو ان تمام تجربات سے ہٹ کر نبی کو دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال جیسے مفکرین نے ولیم جیمز کے اس استدلال کو استعمال کیا' بلکہ ان کے نزدیک علامہ اقبال کا فکر وہ بیانیہ ہے جو ولیم جیمز کے اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ رشید ارشد صاحب لکھتے ہیں:

''اقبال کے ہاں سب سے بڑی مشکل وہی ہے جس کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا' وحی اور غیر وحی کا امتیاز باقی نہ

رہنا۔ نبی اور غیر نبی کے حالات اور احوال کو اپنے جوہر میں ایک سمجھنا' اور آمد وحی کو صوفیانہ اور نفسیاتی تجربے کی طرح کا ایک تجربہ سمجھنا۔''

اس بحث کو وہ ان الفاظ کے ساتھ conclude کرتے ہیں:

''مذہبی تجربے کو علم بنانے کی سعی کے پیچھے ایک بہت بڑا سمجھوتہ برسرِ عمل دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے علم کی جدید تعریف کو قبول کر لیا ہے اور مذہب کو بھی اس تعریف کے دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔ یہ مذہب کو empiricize کرنا ہے جو کسی بھی درجے میں خود مذہب ہی کے لیے نا قابلِ قبول ہے۔ یہ تمام کوششیں بے بس ہو کر کی جا رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں مذہب کو سکیڑنے کا رویہ لازماً پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی مذہبی تجربے کو فلسفیانہ کسوٹی پر پرکھنے کا جو اہتمام کیا ہے اس میں کہیں بھی علم اور تیقن کی موجودہ ساختوں کو مسمار یا درست کرنے کی کوشش نہیں کی گئی' بلکہ انہیں معیار مان کر مذہبی حقائق و احوال کو ان کی سطح تک پہنچانے کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ فرض کرنا بھی بہت عجیب لگتا ہے کہ ایمان بالغیب کی اساس پر تعمیر ہونے والی عمارت حواس تک محدود ہو جانے والے تیقن کے دائرے میں لائی جا سکتی ہے۔ مذہبی واردات کی نفسیاتی اور عقلی تحلیل کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ ہم مذہب سے تشکیل پانے والے مجموعی شعور کی روشنی میں علم اور تیقن کی موجودہ conditions کو پرکھتے اور ان کی اصالت (principalization) کا وہ اہتمام کرتے جو مذہبی شعور اور روحانی تناظر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن ہم نے بالکل مختلف کام کیا اور اس کا نتیجہ اب بھگت رہے ہیں۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا اور مذہب جیسے مابعد الطبیعی حقائق کو جب بھی ہم اپنی محدود عقل میں لانے کی کوشش کریں گے تو ہمارے ذہن کی محدودیت ان کو لازماً محدود کر دے گی۔ اس لیے اس منہج پر جو بھی کاوش ہو گی اس سے مذہبی سوچ کی کچھ گنجائش تو پیدا ہو سکتی ہے پر اس کو 'جیسا کہ یہ ہے (as is)' ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

رشید ارشد صاحب کے اس تجزیے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پھر اس کا حل کیا ہونا چاہیے۔ رشید ارشد صاحب نے اس کے مقابلے میں جو منہج پیش کیا ہے' کیا اس کے ذریعے بھی مذہبی فکر 'جیسا کہ یہ ہے' ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا مسلمان کسی ایسے مذہب کو قبول کر سکتا ہے جو تمام مذاہب سے مل کر 'اجتماعی مذہبی شعور' کے تحت تشکیل پایا گیا ہو؟ ہرگز نہیں۔ اس سے 'وحدت ادیان' کی راہ ہموار نہیں ہو گی؟ تو پھر رشید ارشد صاحب کا علامہ اقبال کے منہج پر اعتراض بے معنی ہے۔ بلکہ دعوت کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا منہجِ کلام زیادہ موزوں نظر آتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے جدیدیت سے مرعوب ذہن کو مذہبی شعور کے قریب لانے میں مدد مل سکتی ہے۔ جدید سوچ تو مذہب کی بنیاد کو عقلاً غلط ثابت کرنے کے بعد استوار ہوئی۔ اور ویسے بھی اگر آج کے دور میں ہم مذہبی شعور کو بغیر کسی دلیل کے مسلم مان کر کوئی نیا ورلڈ ویو تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں تو فکر مادیت کے اس ہمہ گیر غلبے کی فضا میں یہ کلی بن کھلے مرجھا جائیگی۔ آج مادی فلسفہ و فکر کے تسلط کے دور میں اگر مذہبی شعور کو کسی درجے میں کچھ بھی مدد ملتی ہے تو غنیمت ہے۔ کچھ تو ذہن مادیت سے ہٹ کر مذہبی سوچ کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور یہ رشید ارشد صاحب تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اس کاوش کا کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے۔

احقر کے نزدیک حل یہی ہے کہ ہم مذہب سے متعلق مابعد الطبیعی حقائق کو عقل کے مطابق لانے کی بجائے اگر اس کے ماخذ یعنی قرآن کو عقلاً صحیح ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر مذہب سے تشکیل پانے والے مجموعی شعور کی بجائے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں کی روشنی میں 'علم و تیقن کی موجودہ conditions کو پرکھ کر اور ان کی اصالت principalization کا اہتمام' کر کے ایک نیا ورلڈ ویو اور تصور انسان تشکیل دینے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور یہ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون میں واضح کیا ہے کہ دلیل معجزہ ہی سے ممکن ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے ہم دین اسلام 'جیسا کہ وہ ہے' کو صحیح ثابت کر کہ ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ کے چیلنج کے ساتھ 'اتمام حجت علی الناس' کر سکتے ہیں۔ ورنہ چاہے علامہ اقبال کا منہج ہو یا رشید ارشد صاحب کا' نتیجہ ایک نئے دین اور ایک نئی مذہبی سوچ کی صورت میں ہی نکلے گا جو خود اسلام کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

بہر حال دعوت کے نکتہ نظر سے علامہ اقبال کے منہج کی گنجائش بنتی ہے۔ تشکیل جدید کے لیکچرز کو اگر ایک طرف رکھا جائے تو شاعرانہ کلام والا علامہ اقبال ٹھیٹھ اسلامی عقائد اور اسلامی اصولوں پر کھڑا نظر آتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال تشکیل جدید میں پیش کیے گئے نظریات کو ان اسلامی تصوّرات پر مسلّط نہیں کرتے جن کی بنیاد علمِ وحی پر ہے۔ اس کے برعکس ان کی کاوش کا مطمحِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ' نفسیات' اور طبیعیات میں جدید رجحانات کی روشنی میں مذہبی فکر کی جتنی تائید ممکن ہو سکے کی جائے تا کہ جدید ذہن سے مغربی فکر کا رعب کچھ کم ہو۔ وہ خود ان نظریات کو حتمی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک وقت کے ساتھ ساتھ ان پر مزید کام ہوتا رہے گا۔ تشکیل جدید کے ابتدائیے میں فرماتے ہیں:

''میں نے اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کی جدید ترقیات کی روشنی میں اسلام کے مذہبی نظریات کو مرتّب کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے معلومات میں اضافہ ہوگا اور فکر کی نئی راہیں کھلتی جائیں گی' نئی اور زیادہ صحت مند آراء پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ انسانی فکر کے ارتقاء پر نظر رکھیں اور اس کی طرف اپنے آزاد تنقیدی رویئے برقرار رکھیں۔''

(ڈاکٹر علامہ اقبال' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اردو ترجمہ)' دیباچہ' بزم اقبال لاہور' ۱۹۵۸)

چنانچہ اگر اقبال کی سوچ یہ ہے کہ 'مذہب کو اپنی بقاء کے لیے علمی طور پر empiricize ہونا ہوگا' تو اس سے مراد ان کی یہ نہیں ہے کہ 'مذہب اگر ہماری بنائی ہوئی دلالتوں کا مدلول نہیں ہے تو اسے ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے' بلکہ وہ یہ اس لیے چاہ رہے ہیں کہ اس مسلم ذہن کو جس نے مغرب کے زیر تسلّط ایک مخصوص سوچنے کی عادات (Habits of Thought) اپنا لی ہیں' دین اسلام کی طرف مائل کر سکیں۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تعارف وتبصرہ

(۱)

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے

مصنف : میجر (ر) سید حیدر حسن

ضخامت: ۳۸۴ صفحات قیمت: ۸۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : کمبائنڈ پبلشرز' الکریم مارکیٹ' اردو بازار لاہور

زیر تبصرہ کتاب کے چھ حصوں میں مصنف کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین ہیں' جب کہ ساتویں حصے میں غیر مطبوعہ مضامین ہیں۔

مصنف کو پاکستان کے ساتھ والہانہ محبت ہے۔ پاکستان کے گزشتہ اور موجودہ حالات سامنے ہونے کے باوجود وہ پرامید ہے کہ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا۔ مصنف قائداعظم محمد علی جناح کا عقیدت مند ہے اور انہیں پیار سے میرا بابا کہتا ہے۔ وہ قائداعظم کو روحانی شخصیت قرار دیتا ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ لکھتا ہے کہ جناح صاحب کے بعد پاکستان کو ملک کے لیے خیر خواہ قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ اکثر حکمران دولت اکٹھی کر کے ملک سے باہر جمع کرنے میں مشغول رہے اور پاکستان کے مفادات کو سامنے نہ رکھا۔ حکمرانوں کا نام بنام ذکر کر کے ان کی وطن اور اسلام کے ساتھ عدم دلچسپی ظاہر کی ہے۔ وہ پرویز مشرف کو امریکہ کا چوکیدار اور قومی مجرم گردانتا ہے۔ اس کے برعکس عبدالقدیر خان کو محبِّ وطن پاکستانی' قوم کا خیر خواہ اور محسنِ پاکستان قرار دیتا ہے۔

مصنف کا تجزیہ ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان کو اگر وفادار حکمران ملتے اور یہاں اسلامی نظام نافذ ہوتا تو نہ پاکستان دولخت ہوتا اور نہ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود استعماری طاقتوں کا دست نگر بنتا۔ مصنف کو انتہائی دکھ ہے کہ افغانستان میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو باطل طاقتیں اس کو ختم کرنے کے لیے اکٹھی ہوگئیں اور پاکستان کے حکمرانوں نے ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر بم برسائے اور اسلامی حکومت ختم کر ڈالی۔ تاہم افغانیوں کے دل سے اسلام کی محبت نہ کھرچ سکے۔ مصنف اس بات سے سخت رنجیدہ ہے کہ حکمرانوں سمیت' سیاست دانوں کا ایک طبقہ پاکستان کے قیام کو غلط تصور کرتا ہے اور اس سراپا جھوٹ کو پھیلا رہا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں بنا تھا۔

مصنف فوجی جوان رہا ہے۔ اس نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور اس کی یونٹ کے جے سی او اور سپاہی بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کے خلاف لڑے۔ کرنل سید فاروق رحمان مصنف کی یونٹ سے تھے۔ انہی نے بعد میں شیخ مجیب الرحمٰن کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ صفحہ ۳۰۷ پر ان کا انٹرویو موجود ہے۔

کتاب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر کے دو انگریزی مضامین کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ وائس چانسلر صاحب بنگالی ہونے کے باوجود اردو کو قومی زبان قرار دینے کے حق میں تھے:

1- Language Movement in East Pakistan.
2- Bengali Nationalism, What are the facts.

ان دونوں کا اردو ترجمہ اس کتاب میں شامل ہے۔ ان مضامین میں چشم کشا حقائق بیان کیے گئے ہیں کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے پاکستان دولخت ہوا۔

مصنف نے اپنے ہم عصر حکمرانوں آصف علی زرداری اور نواز شریف کے نام کھلے خط لکھے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ ایک خط محسن پاکستان عبدالقدیر خان کے نام بھی لکھا جس میں ان کے ساتھ عقیدت اور محبت کا اظہار کیا اور ان کی جرأت کو سلام پیش کیا۔ کتاب میں چند تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب کے اخیر میں چند صائب الرائے افراد کے تبصرے بھی ہیں۔ جن میں مصنف کی اس کوشش کو سراہا گیا ہے۔

(۲)

نام کتاب : ارمغانِ فانی

موَلف : نوراللہ نوروزیرستانی

ضخامت : ۲۷۲ صفحات

ملنے کے پتے : ☆ القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد ضلع نوشہرہ

☆ مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور

مولانا محمد ابراہیم فانی عالمِ دین، ادیب اور شاعر تھے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی انہیں آسمانِ علم وادب کا روشن آفتاب کہتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے حافظ محمد ابراہیم فانی کا تعارف کرایا ہے اور اس کا نام ''ارمغانِ فانی'' رکھا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں وہ مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو ماہ نامہ القاسم میں چھپتے رہے۔ فانی صاحب مولانا عبدالقیوم حقانی کے مداح تھے۔ چنانچہ انہوں نے حقانی صاحب کی تصانیف پر منظوم تاثرات لکھے جو شاملِ اشاعت ہیں۔ فانی صاحب کی بعض تصنیفات بھی تھیں جنہیں علماء نے پسند کیا۔ فانی صاحب نے مقتدر علماء کے ساتھ جو خط وکتابت کی وہ بھی ایک باب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ کتاب شعروادب کا اچھا مجموعہ ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

(Recap of Surah An-Nisa, Introduction to Surah Al-Ma'idah and exposition of verses 01 - 05 of Surah Al-Ma'idah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

A comprehensive recap of Surah 4, An-Nisa

The reader would recall that we had concluded our exposition of Surah An-Nisa in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the entire Surah follows:

Subject: Consolidation of the Islamic Community

The main object of Surah An-Nisa is to teach the Muslims the ways that unite a people and make them firm and strong as an *Ummah*. In addition, the Surah contains divine instructions for the stability of the institution of 'family', which is the nucleus of the Islamic social fabric and community life. The Surah also urges Muslims to prepare themselves for the defence of their collective whole from the enemies of Islam. Side by side with these, the Surah teaches Muslims about the importance of the propagation of Islam. Above all, the importance of the highest moral character in the scheme of consolidation of the Muslim *Ummah* (community/state) has been ardently impressed upon.

Topics and their Interconnection

In the Surah, just, fair and equitable laws and regulations for the smooth running of family life have been laid down for the husband and wife. Detailed instructions have been given for the division of inheritance and due regard has been paid to the rights of orphans. *(Ref: verses 1 – 35)*

In order to inculcate the right spirit for the observance of divine rules and regulations, the Muslims have been enjoined to show generosity to every soul around them and to be free from meanness, selfishness and stinginess of mind, these are essential for the consolidation of the *Ummah* (community/state) and necessary for the effective propagation of Islam. *(Ref: verses 36 – 42)*

The ways of the purification of mind and body for the offering of *Salat* have been taught because the act of worship (prayer) plays a fundamental part in every scheme of moral and social reform. *(Ref: verse 43)*

After moral preparation, instructions for the defence of the Muslim *Ummah* (community/state) against the enemies of Islam have been

given. First of all, the Muslims have been warned to be on their guard against the cunning machinations and vile practices of the local Jews who were hostile to the New Movement established in Madinah after *Hijrah.* This caution was necessary for removing some possible misunderstanding that might have arisen on account of the pre-Islamic alliance between the people of Madinah and the Jews. *(Ref: verses 44 – 57)*

Thereafter, Muslims have been enjoined to place their trusts and offices of trust in the custody of honest and qualified persons, and to do what is just and right, and to obey Allah *(SWT)*, His Messenger *(SAAW)* and those among themselves entrusted with the conduct of their affairs. Muslims are strictly instructed to turn to Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)* for the settlement of their disputes. The Muslims have also been warned that any deviation from the paths mentioned above would lead to their disintegration. *(Ref: verses 58 – 72)*

After this pre-requisite, the Surah then exhorts Muslims in detail the nature of preparation required for their defence against the enemies of Islam and urges them to fight bravely for the cause of Islam, without showing any kind of cowardice or weakness. The Surah also warns Muslims to be on their guard against the hypocrites. In this regard, a line of demarcation has been drawn in the Surah to distinguish the intentional hypocrites from the helpless devotees. *(Ref: verses 73 – 100)*

The Surah again gives instructions for the offering of *Salat* during military campaigns and actual fighting. This is to emphasise the importance of *Salat* even at the time of fear and danger. *(Ref: verses 101 – 103)*

Before proceeding on to the next topic, the Muslims have been exhorted to persevere in their fight without showing any kind of weakness, once more. *(Ref: verse 104)*

In order to make the Islamic Community firm and strong for defence, the Muslims have been enjoined to observe the highest standard of justice. The Muslims are required to deal out strict, fair and honest justice even in case of the enemy with whom they might be involved in war. They should also settle household disputes with absolute

justice and fairness. In order to ensure this, they should keep their beliefs and deeds totally free from every kind of impurity and should become the standard bearers of justice. *(Ref: verses 105 – 135)*

Resuming the theme of defence, the Muslims have been warned to be on their guard against their enemies, which include the polytheists, the hypocrites and the people of the Book. As belief in Allah *(SWT)*, Devine Revelation on the Prophet *(SAAW)* and the notion of Life after death are the real safeguards against every kind of enemy, they should sincerely believe in and follow His Messenger, Muhammad *(SAAW)*, in letter and spirit. *(Ref: verses 136 – 175)*

The final verse of the Surah deals, once again, with the family laws, first referred to in verses 1 – 35 of the Surah. This verse has been added as a supplement at the end of this Surah because it was revealed long after An-Nisa was being recited in the order from verse 1 – 175 and hence the final verse would logically be added at the end. *(Ref: verse 176)*

An introduction to Surah 5, Al-Ma'idah

Name

This Surah takes its name from verse 112 in which the word 'Mai'dah' (The Repast/The table laden with food) occurs. Like the names of many other Surahs, this name has no special relation to the subject of the Surah but has been used merely as a symbol to distinguish it from other Surahs.

Period of Revelation

The theme of this Surah indicates, and traditions support it, that it was revealed after the treaty of *Hudaibiyah* at the end of 6 A.H. or in the beginning of 7 A.H. That is why it deals with those problems that arose from this treaty.

The Holy Prophet *(SAAW)* with 1400 Muslims went to Makkah in *Zil-Qaadah* 6 A.H. to perform *Umrah,* but the *Quraish* spurred by their enmity, prevented him *(SAAW)* from its performance, though it was utterly against all the ancient religious traditions of Arabia. After a

good deal of hard and harsh negotiations, a treaty was concluded at *Hudaibiyah* according to which it was agreed that he *(SAAW)* could perform *Umrah* the following year. That was a very appropriate occasion for teaching the Muslims the right way of performing a pilgrimage to Makkah with true Islamic dignity, and enjoining that they should not prevent the disbelievers (of that time) from performing pilgrimage to Makkah as a retaliation for their misbehaviour. This was not difficult at all as many disbelievers had to pass through Muslim territory on their way to Makkah. This is why the introductory verses deal with the things connected with pilgrimage to Makkah and the same theme has been resumed in verses 101-104 of the Surah. The other topics of this Surah also appear to belong to the same period.

It can be said with certainty that verse 3 of the Surah was revealed on the 9th of *Zilhijjah* during the Farewell Pilgrimage (*Hajjah Tul Wida*) of the Holy Prophet *(SAAW)*. The said verse is also believed to be the last verse of the Qur'an revealed unto the Holy Prophet *(SAAW)*, as far as verses that ordain commandments and edicts are concerned. To put it in perspective, with the revelation of verse 3 of this surah in the holy city of Makkah, all edicts and commands from Allah *(SWT)* to human beings (Muslims and non-Muslims alike) were completed. Having said that, there appears to be not the least bit of gap or even the slightest appearance of disjoint anywhere in the Surah to suggest that it might have comprised two or more discourses.

Occasion of Revelation

This Surah was revealed to suit the requirements of the changed conditions which were now different from those prevailing at the time of the revelation of Surahs *Aal-e-Imran* and *An-Nisa*. Back then, the shock of the setback at *Uhd* had made the very surroundings of Madinah dangerous for the Muslims, but now Islam had become an invulnerable power and the Islamic State had extended to Najd on the east, to the Red Sea on the west, to Syria on the north and to Makkah on the south. The setback which the Muslims had suffered at *Uhd* had not broken their determination. It had rather spurred them to action. As a result of their continuous struggle and unparalleled sacrifices, the power of the surrounding clans, within a radius of 200 miles or so, had been broken. The Jewish menace which was always threatening

Madinah had been totally removed and the Jews in the other parts of Hijaz had become tributaries of the State of Al-Madinah. The last effort of the *Quraish* to suppress Islam had been thwarted in the Battle of the Ditch (Trench). After this, it had become quite obvious to the Arabs that no power could suppress the Islamic movement. Now Islam was not merely a creed which ruled over the minds and hearts of the people but had also become a State which dominated over every aspect of the life of the people who lived within its boundaries. This had enabled the Muslims to live their lives without let or hindrance, in accordance with their beliefs.

Another development had also taken place during this period. The Muslim civilization had developed in accordance with the principles of Islam and the Islamic viewpoint. This civilization was quite distinct from all other civilizations in all its details and distinguished the Muslims clearly from the non-Muslims in their moral, social and cultural behaviour. Mosques had been built in all territories, prayer had been established and *Imam* (leader) for every habitation and clan had been appointed. The Islamic civil and criminal laws had been formulated in detail and were being enforced through the Islamic courts. New and reformed ways of trade and commerce had taken the place of the old ones. The Islamic laws of marriage and divorce, of the segregation of the sexes, of the punishment for adultery and calumny, etcetera, had cast the social life of the Muslims in a special mould. Their social behaviour, their conversation, their dress, their very mode of living, their culture and traditions had all taken a definite shape of its own. As a result of all these changes, the non-Muslims could no longer expect that the Muslims would ever return to their former fold.

Before the treaty of *Hudaibiyah,* the Muslims were so engaged in their struggle with the non-Muslim, the pagans of *Quraish* in particular, that they got little or no time to propagate their message openly and elaborately. This hindrance was removed by what was apparently a defeat but in reality a victory at *Hudaibiyah.* This gave the Muslims not only peace in their own territory but also respite to spread their message in the surrounding territories. Accordingly, the Holy Prophet *(SAAW)* addressed letters to the rulers of Persia (Iran), Egypt, the

Roman Empire and the chiefs of Arabian Peninsula, inviting them to Islam. At the same time, the missionaries of Islam spread among the clans and tribes and invited them to accept the Divine Way of Allah *(SWT)*. These were the circumstances at the time when Al-Ma'idah was revealed.

Topics

The Surah deals with the following three main topics:

1- Commandments and instructions about the religious, cultural and political life of the Muslims.

In this connection, a code of ceremonial rules concerning the journey for *Hajj* has been prescribed; the observance of strict respect for the emblems of Allah *(SWT)* has been enjoined; and any kind of obstruction or interference with the pilgrims to the *Kaabah* has been prohibited. Definite rules and regulations have been laid down for what is lawful and unlawful in the matter of food, and self-imposed foolish restrictions of the pre-Islamic age have been abolished. Permission has been given to take food with the people of the Book and to marry their women. Rules and regulations for the performance of *Wudu* (ablutions), *Ghusal* (bath) and *Tayammum* (dry ablution) have been prescribed for the sake of purification. Punishments for rebellion, disturbance of peace and theft have been specified. Drinking and gambling have been made absolutely unlawful. Expiation for the breaking of oath has been laid down and a few more things have been added to the law of evidence.

2- Admonition to the Muslims of remaining but Allah's *(SWT)* rightful and representative *Ummah* on earth.

Now that the Muslims had become a ruling body, it was feared that power might corrupt them. At this period of great trial, Allah *(SWT)* has admonished them over and over again to stick to justice and to guard against the wrong behaviour of their predecessors, the people of the Book. They have been enjoined to remain steadfast to the Covenant of obedience to Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)*, and to observe strictly their commands and prohibitions in order to save themselves from the wrath which befell the Jews and the Christians who had violated them. They have been instructed to

observe the dictates of the Holy Qur'an in the conduct of all their affairs and warned against the attitude of hypocrisy.

3- Admonition to the Jews and the Christians for their wrongdoings and invitation to accept Islam.

As the power of the Jews had been totally weakened and almost all their habitations in north Arabia had come under the rule of the Muslims, they have been warned again about their wrong attitude and invited to follow the Right Way.

At the same time a detailed invitation has also been extended to the Christians. The errors of their creeds have been clearly pointed out and they have been admonished to accept the guidance of the Holy Prophet *(SAAW)*.

Incidentally, it may be noted that no direct invitation has been made to the *Majusis* (Zoroastrians) and idolaters/polytheists living in the adjoining countries, because there was no need for a separate address for them as their condition had already been covered by the addresses to the *mushriks* (polytheists) of Arabia.

Subject: Consolidation of the Islamic Community

In continuation of the instructions about the consolidation of the Islamic Community given in Surah An-Nisa, the Muslims have been directed to observe and fulfil all their obligations and further regulations have been prescribed to train the Muslims for that purpose.

They have also been particularly warned as rulers to guard against the corruption that generally comes with power and authority, and have been directed to observe the Covenant of the Qur'an. They have been directed to learn lessons from the failings of their predecessors, the Jews and the Christians, who in their turn have been admonished to give up their wrong attitudes towards the Right Way and accept the guidance taught by Prophet Muhammad *(SAAW)*.

Topics and their Interconnection

The Believers have been ordained to fulfil scrupulously all of their obligations and follow the regulations prescribed by the Divine Law about food, sex, *Salat*, justice, etcetera. *(Ref: verses 1 – 10)*

The Muslims have been warned to guard against the errors of their predecessors; they should follow the Right Path and avoid the bad example of the Jews and the Christians, who broke their Covenants and went astray into evil ways. They, in their turn, have been admonished to give up their wrong ways and accept Islam. *(Ref: verses 11 – 26)*

The story of the two sons of Prophet Adam *(AS)* has been related to reproach the Jews for their plot to kill the Holy Prophet *(SAAW)* and his Companions *(RA)*. *(details in verse 11)*. The story has also been used to emphasize the sanctity of human life. *(Ref: verses 27 – 32)*

To achieve this object, punishments have been prescribed for those who create chaos in the Islamic State, and the Believers have been urged to exert their utmost to establish the Right Way; the sanctity of property has also been emphasized. *(Ref: verses 33 – 40)*

The Holy Prophet *(SAAW) (and through him the Muslims)* has been reassured that he should not mind the enmity, the evil designs and the machinations of the Jews, but continue exerting his utmost to establish the Right Way in accordance with the Guidance of the Quran; for nothing else could be expected from those who had forsaken their own Torah. He *(SAAW)* should deal with the Christians likewise, for they, too, had forsaken their Gospel. *(Ref: verses 41 – 50)*

In view of the degenerate moral condition of the Jews and the Christians, the Believers have been warned not to make them their friends, allies and confidants. Likewise, they should be on their guard against the evil designs of the hypocrites, the disbelievers and the like and should rely on the true Believers alone. The people of the Book have, in their turn been exhorted to give up their enmity and adopt the right attitude, for they cannot get salvation without this. *(Ref: verses 51 – 69)*

The Christians have been especially reproved for their errors in regard to the doctrine of *Tauhid,* the Oneness of Allah *(SWT)*. At the same time, however, they have been preferred to the hard-hearted Jews, for there are among them some who are more inclined towards the Truth. *(Ref: verses 70 – 86)*

In the portion of the Surah that follows, further regulations about the lawful and the un-lawful, in addition to those contained in verses 1 – 10, have been given. *(Ref: verses 87 – 108)*

At the end of the Surah, the mention of the conversation that will take place between Allah *(SWT)* and His Prophets *(AS)* on the Day of Judgment, has been made for the benefit of the erring people to serve as a corrective to their creeds. The conversation with Prophet Jesus *(AS)* has been cited as a specimen to warn particularly the Christians, who profess to believe in him *(AS)*, and generally all those people who put false hopes in their Prophets *(AS)*. *(Ref: verses 109 – 119)*

Conclusion: The entire focal point of the Surah is concluded in the final verse in which Allah *(SWT)* says, "O mankind! The Sovereignty of the heavens and the earth belongs to Allah (alone): therefore, you should become His true servants and fear Him, for He has full powers over everything." *(Ref: verse 120)*

Exposition of verses 01 to 05 of Surah Al-Ma'idah

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

In the name of Allah, the Most Gracious (Beneficent), the Most Merciful.

Verse 01

اٰیَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَـکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ①

"Believers! Honour your bonds! All grazing beasts of the flock are permitted to you except those which are recited to you hereinafter, but you are not allowed to hunt in the state of Ihram (a state of pilgrim sanctity). Indeed, Allah decrees as He wills."

The opening statement of the Surah enjoins that people ought to abide by the limitations and prohibitions laid down in this Surah and elsewhere in the law of Allah *(SWT)*. This brief introductory statement is followed by an enunciation of those prohibitions which people are required to observe.

The Arabic word *an'am* (cattle) denotes camels, oxen, sheep and goats, whereas the word *bahimah* means all grazing quadrupeds. Had Allah *(SWT)* said that *an'am* had been made lawful for them, this permission

would have included only those animals to which the term *an'am* is applicable. But the terms in which the injunction is conveyed are *bahimat al-an'am* (all grazing beasts of the flock). Hence the permission is of wider import and embraces all grazing quadrupeds of the cattle type, i.e. which do not possess canine teeth, which feed on plants rather than animals, and which resemble the cattle found in Arabia in other characteristics. This implies that the flesh of those animals which have canine teeth and are carnivorous is not permissible. This implication was elucidated by the Prophet *(SAAW)* and is embodied in a tradition in which he *(SAAW)* prohibited those beasts which kill and eat other animals. Likewise, the Prophet *(SAAW)* also prohibited birds with claws and those that feed on carrion. According to a tradition transmitted by Ibn Abbas *(RA)*, "The Messenger of Allah *(SAAW)* prohibited all beasts with canine teeth and all birds with claws." *(Bukhari, Muslim, Abu Da'ud, Nasa'i, Tirmidhi, Ibn Majah, etc.)*

Ihram is the name of the simple apparel worn at the time of Pilgrimage. In every direction around the *Kaabah*, there are certain fixed points beyond which no Pilgrim may proceed without donning this special Pilgrim's garment in place of his normal clothes. This apparel consists of two sheets of untailored cloth, one of which is wrapped around the lower part of the body while the other is thrown over the upper part. This manner of dressing is termed *ihram* because once a man has assumed it he must treat as prohibited a number of things which are ordinarily lawful, for example either shaving or trimming the hair, or using perfumes and other items of toiletry and the gratification of sexual desires. These restrictions also extend to both killing and hunting, and to leading anyone else to either kill or hunt an animal. For women, the *ihram* is their ordinary household clothes.

Allah *(SWT)* is the absolute sovereign and has absolute authority to issue whatever command He might will. His creatures do not have the right to complain about any of these orders. Even though wisdom (*hikmah*) underlies the ordinances of Allah *(SWT)*, a true believer does not obey them because he considers them either appropriate or conducive to his best interests. He obeys them simply because they

are the ordinances of his Lord *(SWT)*. He holds unlawful all that Allah *(SWT)* has declared unlawful, because Allah *(SWT)* has so decreed it; whatever He has declared lawful is regarded as such for no other reason than that Allah *(SWT)*, the Lord of all, has allowed His servants the use of it. Hence the Qur'an establishes very firmly the principle that nothing except permission from the Lord *(SWT)* - or lack of it - is to be taken into consideration in deciding what is lawful and what is not.

It must be noted here that whatever has been made lawful or unlawful by the Messenger of Allah *(SAAW)* also falls under the same category, as Muhammad *(SAAW)* came as the prophet, vicegerent and representative of Allah *(SWT)* in this world.

(And Allah *(SWT)* knows Best!)

Verse 02

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

"Believers! Neither desecrate the symbols of (devotion to) Allah, nor the holy month, nor the animals of offering, nor the animals wearing collars indicating they are for sacrifice, nor ill-treat those who have set out for the Holy House (Kaabah) seeking from their Lord His bounty and good pleasure. But once you are free from Pilgrimage obligations, you are free to hunt. Do not let your wrath against the people who have barred you from the Holy Mosque (Masjid Al-Haraam) move you to commit undue transgressions; rather, help one another in acts of righteousness and piety, and do not help one another in sin and transgression. Fear Allah. Surely Allah is severe in retribution."

Whatever characteristically represents either a particular doctrine, creed, way of thought or conduct is recognized as its symbol. For example, official flags, uniforms of the armed forces, coins, notes and stamps are symbols used by governments so that their subjects - in fact all those who live within their sphere of influence - treat them

with proper respect. Cathedrals, altars and crosses are symbols of Christianity. A special bunch of hair on the head, a special kind of bead-rosary and the temple are symbols of Hinduism. A turban, bracelet and *Kirpan* (a special dagger kept by the Sikhs) are symbols of the Sikh religion. The hammer and sickle are the symbols of Communism. The swastika has been the symbol of Aryan racialism. The followers of these ideologies are required to treat these symbols with respect. If a man insults any symbol associated with a particular ideology it is regarded as an act of hostility; and if the person concerned is himself a follower of that ideology then that insult is considered tantamount to an abandonment of, and a revolt against it.

The expression '*sha'a'ir Allah*' refers to all those rites which, in opposition to polytheism and outright disbelief and atheism, are the characteristic symbols of an exclusive devotion to Allah *(SWT)*. Muslims are required to respect these symbols, regardless of the people among whom they are found, provided their underlying spirit is one of Allah's *(SWT) Tauhid* and that they have not been tainted by either polytheistic or pagan associations. Hence, whenever a Muslim encounters something in either the creed or practice of a non-Muslim, which embodies any element of devotion and service to the One True Allah *(SWT)*, he will identify himself with it and show respect to the symbols which represent it. For this true element in their religious life constitutes the point of agreement between them and the Muslims. The point of dispute and departure is not that they serve Allah *(SWT)*, but that they associate others in that service.

It should be recalled that this directive to treat the symbols of Allah *(SWT)* with due respect was given at a time when a state of belligerency existed between the Muslims and the polytheists of Arabia, and Makkah was under the occupation of the latter. Polytheistic tribes from all over Arabia used to visit the Kaabah for Pilgrimage, and the routes of many of these tribes were within the reach of the Muslims if they decided to attack. It was in such circumstances that the Muslims were told that, even though those people were polytheists, they should not be molested if they were proceeding towards the '*House of Allah (SWT)*'; that they should not

be attacked during the months of Pilgrimage; and that the animals which they were carrying for sacrificial offering should not be touched. The element of the *Tauhid* of Allah *(SWT)* which persisted in their otherwise distorted religious life deserved to be respected.

Following a general directive that the symbols of Allah *(SWT)* should be treated with proper respect a few such symbols are mentioned specifically lest war-phobia lead even to the desecration of religious rites and symbols. The enumeration of these particular symbols does not mean that respect is due to these alone.

Ihram is also one of the symbols of Allah *(SWT)* and violation of any of the prohibitions which should be observed in that state is an act of sacrilege. The prohibition of hunting while in the state of *ihram* is mentioned in connection with the desecration of the symbols of Allah *(SWT)*. When *ihram* is over, the prohibitions become void, and one is permitted to hunt.

The unbelievers had prevented the Muslims from visiting the *Kaabah*. In fact, in violation of the ancient usage of Arabia they had even deprived them of their right to make Pilgrimage. As a result, the Muslims felt inclined to prevent the pagan tribes from making their pilgrimage by not letting them pass along the routes to Makkah which lay close to the Islamic domains, and to attack their trading caravans during the time of Pilgrimage (*Hajj*). Allah *(SWT)* prevented them from carrying out this plan through this revelation.

(And Allah (*SWT*) knows Best!)

Verse 03

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ
السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي
مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

"Forbidden to you are carrion (dead and decaying flesh of an animal), blood, the flesh of swine, the animal slaughtered in any name other than Allah's, the animal which has either been

strangled, killed by blows, has died of a fall, by goring or that devoured by a beast of prey - unless it be that which you yourselves might have slaughtered while it was still alive – and that which was slaughtered at the altars. You are also forbidden to seek knowledge of your fate by divining arrows. All these are sinful acts. This day the unbelievers have fully despaired of your religion. Do not fear them; but fear Me. This day I have perfected for you your religion, and have bestowed upon you My bounty in full measure, and have been pleased to assign for you Islam as your religion. (Follow, then, the lawful and unlawful bounds enjoined upon you.) As for he who is driven by hunger, without being wilfully inclined to sin, surely Allah is All-Forgiving, All-Compassionate."

This verse begins by stating certain things that are forbidden to be used as food. The term 'Carrion' signifies the animal which has died a natural death. Blood and swine have also been prohibited as food. The verse also refers as *haram* to the practice of pronouncing the name of anyone or anything other than Allah *(SWT)* and dedicating the animal, as an offering, to either a holy personage, false god or goddess before slaughtering.

It is lawful to eat the flesh of an animal which may have suffered from an accident, provided that it was still alive until slaughtered. This verse also makes it clear that the flesh of an animal becomes lawful only by slaughtering ritually, and that no other method of killing is valid. The words *dhabh* and *dhakah* belong to the technical terminology of Islam and denote slitting the throat so that the blood is completely drained from the animal's body. The disadvantage of killing an animal by either guillotine or strangulation is that the greater part of the blood remains within the body, and at various places it sticks to the flesh and forms congealed lumps. If an animal is slaughtered by slitting the throat, on the other hand, the connection between mind and body remains intact for a short while, with the result that the blood is thoroughly drained out from all the veins and the flesh becomes fully cleansed of blood. We have just come across the injunction prohibiting the eating of blood. So only that flesh which has been purged of blood is declared lawful.

The word *nusub* signifies all the places consecrated for offerings to others than the One True Allah *(SWT)*, regardless of whether they are images of wood, stone or something else.

It must be noted that the division of objects of eating and drinking into lawful and unlawful in this verse is based on their moral rather than their medicinal properties. Allah *(SWT)* has left matters relating to the physical world to be tackled by man's own effort and striving. It is for man himself to discover by his own efforts which items of food and drink provide him with healthy nourishment and which are useless and harmful. The Law *(Shari'ah)* does not take upon itself to guide man in such matters, except for giving a general guideline. Had it undertaken such a task, perhaps one of the first things for it to do would have been to pronounce the prohibition of arsenic oxide. But one will notice that the Qur'an and the Ahadith mention neither arsenic oxide nor other things which either singly or jointly are fatal for man. The underlying considerations of the Law *(Shari'ah)* with regard to the various items of eating and drinking are their possible effects on man's morals and on the purity of his soul. This is in addition to the judgements that the Law *(Shari'ah)* makes with regard to the various means adopted by man in his quest for food - whether they are appropriate according to Islamic standards or not. It is impossible for man to determine what is beneficial and what is harmful for his morals; he has not been endowed with the capacities needed to arrive at sound conclusions on these matters, and so he frequently stumbles into error. Hence the Law *(Shari'ah)* undertakes to guide him in these matters and these matters alone. Whatever has been prohibited by Islam has been prohibited because of its bad effects on human morals, because of its repugnance to spiritual purity, and because of its association with false beliefs. Things which have been declared lawful have been so declared because they are untainted by these evils.

It may be asked why Allah *(SWT)* did not specify the considerations underlying the prohibition of various things for this would have afforded us very valuable insights. In reply, it must be pointed out that it is impossible for us to fully grasp such considerations. The kind

of questions we face are for instance: What are the corrupting effects of the consumption of either blood or the flesh of swine and carrion on our morals? The extent to which this corruption affects our morals, and the way in which certain things affect our morals is a matter that we are incapable of investigating, for we do not possess the means of weighing and measuring the moral properties of various things. To mention some of these bad effects would carry little weight with the sceptic, for how could he test the soundness of statements on such questions? Hence, Allah *(SWT)* considers faith rather than man's own judgement as the main basis for observing the standards of lawfulness and prohibition. Whoever is fully convinced that the Qur'an is the Book of Allah *(SWT)*, that the Prophet *(SAAW)* was designated by Him, and that Allah *(SWT)* is All-Knowing and All-Wise, will necessarily commit himself to observe the restrictions enjoined by Allah *(SWT)* regardless of whether he is able to grasp the wisdom underlying them or not. Whoever lacks this basic conviction will avoid only those evils which are fully evident to human beings, and will remain a prey to all those which have not yet become apparent but which in fact are intrinsically harmful.

The things which are prohibited in this verse fall into the following categories:

(1) Polytheistic divination, which is a form of omen-seeking whereby knowledge either about one's future or about matters beyond human perception, is sought from false gods and goddeses. The polytheists of Makkah had consecrated the idol *Hubal* in the *Kaabah* for this purpose. Seven arrows had been placed at its altars and on each of them different words and sentences had been inscribed. Whenever people were faced with the question whether a certain course was wise or not, or they wanted to trace something lost, or sought a judgement in a murder case, or had other similar problems, they would approach the oracle of *Hubal*, present him with an offering as his fee, and pray to *Hubal* to issue a verdict on the question concerned. Then the oracle would draw arrows, and the inscription on the arrow which fell to a person's lot was deemed to represent the verdict of *Hubal*.

(2) Superstitious divination, which has also been prohibited, means

that instead of deciding the problems of life in a rational way one should decide them on fanciful grounds. Or it could mean deciding matters by arbitrary interpretation of accidental events, or to have one's future prophesied by means which have not been reasonably established as adequate for obtaining knowledge about the future. This includes geomancy, astrology, fortune-telling and the numerous other methods adopted to determine omens.

(3) Games of chance are also prohibited and include all those transactions in which what one receives depends on chance and other purely accidental factors rather than on rational considerations such as either due payment or recompense for services rendered. This applies, for instance, to lotteries where the holder of an arbitrarily-drawn number receives a huge amount of money which has been obtained from thousands of other people.

After prohibiting each of these three categories, the only kind of lot-drawing which Islam permits is that which one resorts to when obliged to make a decision either in favour of one of numerous permissible options or in favour of one out of two or more equally legitimate claimants. For instance, two persons have an equal claim over a thing which neither of them is prepared to relinquish, and at the same time there is no reasonable basis for preferring one to the other. In such a case, with the consent of the claimants, the matter may be settled by drawing lots. The Prophet *(SAAW)* himself used to resort to drawing lots of this lawful nature when he had to make a decision between two equal claimants, and when preferring one of them would cause distress and grievance to the other. *(On the authority of Bukhari, Muslim, Musnad Ahmad bin Hanbal, Ibn Majah, etc.)*

'This day', in the verse, does not signify a particular day or specific date. It refers to that period of time when these verses were revealed. In our own usage, too, expressions like 'today' or 'this day' often have the sense of the 'present time'. 'This day the unbelievers have fully despaired of your religion' refers to the fact that the Muslims' religion (Islam) had developed into a full-fledged system of life, reinforced by the authority and governmental power which it had acquired. The unbelievers who had hitherto resisted its establishment now

despaired of destroying Islam and of forcing the believers back to their former state of Ignorance. The believers therefore no longer needed to fear men: they should fear Allah *(SWT)* alone instead. Indeed, the Muslims were repeatedly asked to fear Allah *(SWT)*, for they would not be treated lightly if they failed to carry out His commands, especially as there was no longer any justifiable excuse for such failure. If they still violated the law of Allah *(SWT)*, there could be no basis for supposing that they did so under constraint: it must mean that they simply had no intention of obeying Him.

The 'perfection of religion' mentioned in this verse refers to making it a self-sufficient system of belief and conduct, and an order of social life providing its own answers to the questions with which man is confronted. This system contains all necessary guidance for man, either by expounding fundamental principles from which detailed directives can be deduced or by spelling out such directives explicitly so that in no circumstances would one need to look for guidance to any extraneous source.

The bounty referred to in the statement: 'I have bestowed upon you My bounty in full measure', is the bounty of true guidance.

The statement, 'I have been pleased to assign for you Islam as your religion' means that, since the Muslims had proved by their conduct and their striving that they were honest and sincere about the commitment they had made to Allah *(SWT)* in embracing Islam - the commitment to serve and obey Him - He had accepted their sincerity and created conditions in which they were no longer yoked in bondage to anyone but Him *(SWT)*. Thus the Muslims were not prevented from living in submission to Allah *(SWT)* out of extraneous constraints just as there were no constraints preventing them from subscribing to true beliefs. Having recounted these favours, Allah *(SWT)* does not point out what should be the proper response to those favours. But the implication is obvious: the only appropriate response on the part of the believers must be unstinting observance of the law of Allah *(SWT)* out of gratitude to Him.

According to authentic traditions this verse was revealed in 10 A.H. on the occasion of the Prophet's *(SAAW)* Farewell Pilgrimage. *(Bukhari, Muslim, etc.)*

(And Allah *(SWT)* knows best!)

Verse 04

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ ۭ قُلْ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"They ask you what has been made lawful to them. Say: 'All clean things have been made lawful to you, and such hunting animals as you teach, training them to hunt, teaching them the knowledge Allah has given you - you may eat what they catch for you – but invoke the name of Allah on it. Have fear of Allah (in violating His Law). Allah is swift in His reckoning."

There is a certain subtlety in how the query is answered in this verse. Religious-minded people often fall into a prohibitionist mentality by tending to regard as unlawful everything not expressly declared as lawful. This makes them excessively fastidious and over-suspicious, and inclined to ask for a complete list of all that is lawful and permitted. The Qur'an's response to this question seems to be aimed, in the first place, at the reform of this mentality. The questioners want a list of what is lawful so they can treat everything else as prohibited, but the Qur'an provides them with a list of what is prohibited and then leaves them with the guiding principle that all 'clean things' are lawful. This means a complete reversal of the old religious outlook according to which everything that has not been declared lawful is considered prohibited. This was a great reform, and it liberated human life from many unnecessary constraints. Henceforth, except for a few prohibitions, the lawful domain embraced virtually everything.

The lawfulness of things has been tied, however, to the stipulation of their being clean so that no one can argue for the lawfulness of things which are unclean. The question which arises at this point is: How are we to determine which things are clean? The answer is that everything is clean apart from those things which can be reckoned unclean either according to any of the principles embodied in the Law *(Shari'ah)* or which are repellent to man's innate sense of good taste or which civilized human beings have generally found offensive to their natural feelings of cleanliness and decency.

The expression 'hunting animals' used in the verse signifies hounds, hawks and all those beasts and birds which men use in hunting. It is a characteristic of animals which have been trained to hunt that they hold the prey for their masters rather than devour it. It is for this reason that while the catch of these trained animals is lawful, provided that it is slaughtered according to the Islamic ritual before death. Islamic jurists, however, disagree on this matter and have varied opinions.

The verse under discussion, however, makes it clear that it is necessary to pronounce the name of Allah *(SWT)* while dispatching a hound to the hunt. If a man later finds the prey alive he should slaughter it. But if he does not find it alive it will still be lawful to eat it since the name of Allah *(SWT)* has already been pronounced. The same rule applies with regard to shooting arrows in hunting.

(And Allah (*SWT*) knows Best!)

Verse 05

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۖ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

"This day all good things have been made lawful to you. The food of the People of the Book is permitted to you, and your food is permitted to them. And permitted to you are chaste women, be they either from among the believers or from among those who have received the Book before you, provided you become their protectors in wedlock after paying them their bridal-due, rather than go around committing fornication and taking them as secret-companions. The work of he who refuses to follow the way of faith will go waste, and he will be among the utter losers in the Hereafter."

The food of the People of the Book includes the animals slaughtered by them. The rule that 'our food is lawful to them and theirs lawful to us' signifies that there need be no barriers between us and the People of the Book regarding food. We may eat with them and they with us. But this general proclamation of permission is preceded by a reiteration of

the statement: 'All good things have been made lawful to you.' This indicates that if the People of the Book either do not observe those principles of cleanliness and purity which are considered obligatory by the Law *(Shari'ah)* or if their food includes prohibited items, then one should abstain from eating them. If, for instance, they either slaughter an animal without pronouncing the name of Allah *(SWT)* or if they slaughter it in the name of anyone else but Allah *(SWT)* it is not lawful for us to eat that animal. Likewise, if intoxicating drinks, the flesh of swine, and any other prohibited thing is found on their dining table we may not justify our partaking of such items on the ground that the persons concerned are People of the Book.

The same applies to those non-Muslims who are not People of the Book, except for one difference - that whereas the animals slaughtered by the People of the Book are lawful provided they have pronounced the name of Allah *(SWT)* at the time of slaughtering them, we are not permitted to eat the animals killed by non-Muslims who are not People of the Book.

The verse also details that Muslim men are allowed to marry those Jewish and Christian women who have been characterized as *muhsanat* (i.e. 'well-protected women'). There are, however, differences among jurists as to the detailed application of this rule and regarding the definition of *'muhsanat'*.

The declaration that marriage to women of the 'people of the Book' is permitted is immediately followed by a warning which, in effect, means that those who avail themselves of this permission ought to be mindful of their faith and morals. Muslims are urged to beware of infatuation with disbelieving women lest they also become enamoured of the ideas and beliefs which they cherish, thereby allowing their faith to dissipate. They are warned against adopting social patterns and modes of conduct inconsistent with the true requirements of their faith.

In any case, all jurists agree that Muslim women are not permitted to marry the menfolk from the 'people of the Book'.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

شعبہ خط و کتابت کورسز کی تاریخ میں ایک اور سنگِ میل کا اضافہ!!

آن لائن کورس

- کیا آپ جاننا چاہتے ہیں؟ ازروئے قرآن ہماری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ نیکی اور تقویٰ اور جہاد اور قتال کی حقیقت کیا ہے؟
- کیا آپ دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ قرآن حکیم کی فکری اساس اور بنیادی عملی ہدایات سے روشناس ہونا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ نجی مجالس میں اسلام پر ہونے والی تنقید کا مناسب اور مدلل جواب دینے کی اہلیت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

تو

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور کے مرتب کردہ

”مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب“ پر مبنی

”قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس“ سے استفادہ کیجیے

یہ کورس (جو ایک عرصہ سے بذریعہ خط و کتابت کروایا جا رہا ہے) شائقین علومِ قرآنی کی دیرینہ خواہش پر

الحمدللہ!

اب یکم ستمبر 2016ء سے آن لائن (ONLINE) بھی شروع ہو چکا ہے

برائے رابطہ: انچارج شعبہ خط و کتابت کورسز، قرآن اکیڈمی، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-35869501(92-42) E-mail:distancelearning@tanzeem.org

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
Oct.-Ded. 2016 Vol. 35 No. 4

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمت کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ